وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي
السَّبِيْل
مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے
نصاب تعلیماتِ اسلامیہ
کے لیے تجاویز
پروفیسر سید سلیمان اشرف
صدر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى

السبیل

نصاب تعلیمات اسلامیہ
مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
کے لیے تجاویز

پروفیسر سید سلیمان اشرفؒ (م ۱۹۳۹ء)

صدر شعبۂ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ادارہ پاکستان شناسی لاہور

کتاب : السبیل
تصنیف : پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف
باراوّل : ۱۹۲۴ء
طبع جدید : ۲۰۱۴ء
: (مع دیباچہ وحواشی)
تعداد : گیارہ سو
ضخامت : ۱۳۲ صفحات
مطبع : اظہار سنز پرنٹرز، لاہور
ناشر : ادارۂ پاکستان شناسی، ۲/۲۴ سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور
فون: ۰۳۲۲-۴۰۰۵۹۵۲
قیمت : ۲۶۰ (دوصد ساٹھ روپے)

ڈسٹری بیوٹرز

خان بک کمپنی، ۳۰ کورٹ اسٹریٹ، لوئر مال، لاہور فون: ۰۴۲-۳۷۳۲۵۴۶۳
ادبستان، ۶۔سی دربار مارکیٹ، میلارام، لاہور فون: ۰۴۲-۳۷۲۱۲۳۴۸
بیکن بکس، گلگشت، ملتان فون: ۰۶۱-۶۵۲۰۷۹۰، ۶۵۲۰۷۹۱
دارالعلوم نعیمیہ، فیڈرل بی ایریا، دستگیر بلاک نمبر ۱۵، کراچی فون: ۰۲۱-۳۶۳۲۴۲۳۶

اپنے عہد کی معروف علمی شخصیت اور ماہر تعلیم پروفیسر تھیوڈور ماریسن Theodore Morison (۱۸۶۳-۱۹۳۶ء)، پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے ۱۸۹۸ء میں لاہور میں برپا ہونے والی ایک تعلیمی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے برملا اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ مغرب میں پڑھائے جانے والے علوم کے ساتھ ساتھ مشرق، بالخصوص اسلامی فکر کی حاصل تعلیم سے بھی استفادہ ازحد ضروری ہے۔

پروفیسر کے اپنے الفاظ کچھ یوں ہیں:

"ہم کو بھی ایک اسلامی یونی ورسٹی کی ضرورت ہے جس سے ایک آنکھ میں مشرقی اور دوسری میں علوم مغربی کی روشنی پیدا ہو، مگر دونوں آنکھوں کی روشنی بالکل اس سے جدا جدا ہو کہ جس سے ماحول کی طرح بجائے ایک ایک چیز کے دو نظر آئیں۔"

پروفیسر فائزہ احسان صدیقی: "تعلیم الفائز دن"، کراچی، ۲۰۰۷ء، صفحہ ۵۱

تعلیم جدید وقدیم کا توازن

وقت آ گیا ہے کہ فریقین اپنی اپنی جگہ پر مسلمانوں کی مختلف تعلیمی ضروریات کا احساس کر کے ایک ایسا تعلیمی نظام مرتب کریں، جو مسلمانوں کی ہر قسم کی دنیوی و مذہبی ضرورتوں پر مشتمل ہوتا کہ آئندہ تصادم کا اندیشہ نہ رہے، اب وہ زمانہ آ گیا کہ نہ تو انگریزی پڑھنا کفر و الحاد خیال کیا جاتا ہے اور نہ مذہبی تعلیم کی ضرورت سے کسی کو انکار ہے، اس لیے کیوں نہ فریقین باہمی معاونت سے کام کریں تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں میں جدید علوم وفنون کا رواج ہو اور دوسری طرف ان کا سینہ مذہبی علوم سے منور ہو، اور اسلامی تہذیب و شائستگی ان کا شعار ہو۔

مولانا سر رحیم بخش، سابق صدر کونسل آف ریجنسی ریاست بہاولپور

بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم از مولوی شمس تبریز خاں، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۴ء، صفحہ ۲۹۵

جوُیندہ یابندہ

مَیں کہ شوئ قسمت سے کم اور احساس زیاں سے محرومی کے باعث زیادہ، ایک احسان فراموش اور محسن کُش قوم کا فرد ہوں۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت اور دست گیری کے زیر اثر، تحریک آزادی اور جدوجہد پاکستان کی تاریخ کی مسخ شدہ تصویر کو نکھارنے کی سعیٔ پیہم کو ایک عبادت کے طور اختیار کیے ہوئے ہوں۔

پہلے 'مکتبہ رضویہ' اور اب 'ادارہ پاکستان شناسی' کے زیر اہتمام، مفاد پرست اور غیر ذمہ دار عناصر کی طرف سے تاریخ کی من چاہی شکل میں پیش کرنے کی مذموم مساعی کی قلعی کھولنے اور حق و صداقت کے پرچم کی سربلندی کے لیے بساط بھر کوشاں ہوں۔

ع گر قبول اُفتد زہے عز و شرف

اپنوں کی ناسپاسی اور غیروں کی منظم سازش کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاں نثاری اور وفاداری بہ شرط استواری کی راہ پر پوری استقامت سے چلتے ہوئے عظیم قربانیاں دینے والے یا تو بے ہُودہ الزامات کے سزاوار ٹھہرے یا پھر گم نامی کی تاریکیوں میں اُتار دیے گئے۔

ایسے ہی زعمائے ملت میں پروفیسر سید سلیمان اشرف، صدر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بھی ہیں، جن کے کام کیا، نام ہی سے نئی نسل واقف نہیں۔ بحمد اللہ! ان کی گراں مایہ کتابیں اس ناچیز کے ہاتھوں جدید زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔

حضرت کی کتاب السّبیل کی تلاش برسوں بے نتیجہ رہی۔ ممتاز محقق حضرت مولانا سیّد نور محمد قادری نور اللہ مرقدہٗ (۱۳ر مئی ۱۹۲۵ء تا ۱۵ر نومبر ۱۹۹۶ء) نے اس سلسلہ میں بہت محنت کی۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو رحمۃ اللہ علیہ (۱۴ر نومبر ۱۹۲۴ء۔ ۳۰ر

جون ۲۰۱۰ء) علی گڈھ کو خط لکھا اور اس کتاب کے حصول کے لیے ان کی مدد چاہی۔ پروفیسر صاحب مرحوم مغفور نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۹۳ء میں سید صاحب کو بدیں الفاظ اس کتاب کی عدم دست یابی سے مطلع کیا:

> افسوس ہے کہ مسائل اسلامیہ مرتبہ مولوی عبدالباسط اور مولانا مرحوم کی الستبیل یہاں نہیں ملی۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے ایک زمانے میں مجھے لکھا تھا کتاب خانہ مولانا آزاد میں بہت تلاش کی نہیں ملی۔ ایک دن خیال ہوا کہ مولانا نے اس کا نسخہ صدر یار جنگ (محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی) کو ضرور دیا ہوگا، ذخیرۂ حبیب گنج جا کر دیکھا، یہ کتاب یہاں اگر کبھی تھی بھی تو اب مفقود ہے۔ کبھی اتفاق سے کہیں مل گئی تو اس کا اور مسائل اسلامیہ کا عکس آپ کو بھیجوں گا۔ مجھے اس بات کی اطلاع نہیں تھی کہ آپ نے مولانا کی تین تصانیف (المبین، الرشاد اور الحج) اپنے مفصل دیباچوں کے ساتھ لاہور سے شائع کر دی ہیں۔ آپ کے مقدمات پڑھنے کے لائق ہوں گے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں تو یہ کتاب نہ مل سکی۔ تاہم عزیز محترم رضاء الحسن قادری سلمہٗ تعالیٰ کی سعیِ سعید کے باعث یہ کتاب راقم کو مل گئی۔ ادارہ پاکستان شناسی جناب رضاء الحسن قادری کی اس کاوش پر سپاس گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور دین حنیف کے لیے اُن کے جذبوں کو فزوں تر کرے۔

...... یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اپنوں کی بے اعتنائی اور ناقدری کا یہ ثبوت کہ ہم ایک عبقری عالم کی قیمتی کتاب کو محفوظ نہ کر پائے اور یہ نسخہ جناب رضاء الحسن کو جامعۂ اشرفیہ، لاہور کی لائبریری سے ملا۔

ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کچھ بھی کہیے، جامعۂ مذکور کے کارکنان کے بھی ہم تہ دل سے شکر گزار ہیں کہ اُن کی علم

دوستی کے باعث ہم اس نادرونایاب نسخہ کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکے۔ اللہ کرے ہمارے علمائے کرام، پیران عظام اور اہل قلم حضرات بھی اپنے مناصب کا حق ادا کرتے ہوئے اکابر زعمائے ملت کی علمی کاوشوں اور عملی خدمات کو نئی نسل تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیں، کہ یہ کار عظیم کسی فرد واحد کے بس کی بات نہیں۔

ع شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات

ناشر

ایک صاحبِ فکر ونظر
کی
ناشر کتاب کی تحسین وحوصلہ افزائی

نمونۂ سلف صالحین، اُستاذ الحدیث، حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی ضیائی دام برکاتہٗ کا گرامی نامہ بنام ظہور الدین خان امرتسری، ناشر کتاب ہذا، محررہ ۹/ مارچ ۲۰۱۴ء ہمارے لیے وجہ صد افتخار اور ہمارے مشن کے لیے گراں مایہ مہمیز کی مانند ہے۔ ہم حضرت کی حوصلہ افزائی پر سراپا تشکر ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:

''جو کام آپ کتب ورسائل کی نشر واشاعت کے سلسلے میں کر رہے ہیں، وہ بڑی دینی خدمت ہے۔ نیز یہ خدمات جلیلہ آپ کی قابل تعریف بھی ہیں اور لائق تقلید بھی۔ اللہ رب العزت ہمارے علماء کرام ومشائخ عظام، خاص طور پر نوجوان علماء کو ان کاموں کی طرف توجہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ احقر کی طرف سے آپ نا صرف کتب ورسائل پر قابل مبارکباد ہیں، بلکہ ان کتابوں پر جو آپ تحقیق وتخریج کا کام کر رہے ہیں، وہ کتابوں کی نشر واشاعت سے بھی زیادہ اہم ہے۔ احقر نعیمی ضیائی آپ کے کتب ورسائل کو اس لیے بھی بنظر تحسین دیکھتا ہے کہ آپ اس عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ عرق ریزی ودماغ سوزی سے کام کر رہے ہیں۔ مولائے کریم اپنے حبیب، رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے مزید دینی کام کرنے کی توفیق رفیق مرحمت فرمائے۔''

آمین ثم آمین بجاہ حبیبہ الامین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فہرس

(فہرست مضامین اندر ملاحظہ فرمائیں)

دیباچہ

اسلامی ہند کے آسمان پر جو ستارے علم و آگہی کے روشن ہوئے، ان میں ایک ممتاز اور نمایاں نام حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ مولانا سلیمان اشرف صوبہ بہار کے مردم خیز قصبہ بہار کے محلہ میر داد کے رہنے والے تھے جہاں معروف صوفی بزرگ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (صاحبِ مکتوباتِ صدی) علیہ الرحمہ کا مزار پُر انوار مرجع خلائق ہے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مولانا حافظ قاری نور محمد اصدقی چشتی قدس سرہٗ سے پڑھیں۔ اور اس کے علاوہ آپ نے مختلف مدارس میں مقتدر اساتذۂ علم و فن سے کسب فیض کیا۔ مولانا نور محمد اصدقی دہلی کے نامور بزرگ خواجہ شاہ قیام اصدق چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد خلفا میں تھے۔ مولانا سلیمان اشرف نے اپنے استادِ گرامی کے دست حق پرست پر بیعت کی، خلافت سے سرفراز ہوئے اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا سلیمان کے والد حکیم سید عبداللہ اور والدہ مخدومہ بھی انہی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھیں۔

مولانا سلیمان اشرف جہاں شریعت و طریقت دونوں کے مجمع البحرین تھے، وہیں وہ علمائے معقولات اور ارباب فلسفہ و حکمت کے درمیان مقام بلند پر فائز دکھائی دیتے ہیں، جس پر ان کی تصانیف شاہد عادل ہیں۔ مولانا ابرار حسین فاروقی گوپاموی ایم، اے (تلمیذ مولانا سلیمان اشرف سابق لکچرار شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی علیگڈھ) اپنے مضمون حضرت مولانا سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ، مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ (بھارت) فروری ۱۹۷۵ء میں لکھتے ہیں:

''مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم، خیرآبادی سلسلہ کے نامور اور ممتاز

فرد اور براہ راست علامہ فضل حق خیر آبادی مرحوم سے مستفیض تھے۔ مولانا سید سلیمان اشرف" کا برتاؤ و اکرام میرے ساتھ علاوہ شاگردی اور ماتحتی کے اسی خیرآبادی سلسلہ کا فیضان تھا، کیونکہ حضرت شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی" کی پھوپھی زاد بہن میری سگی نانی تھیں، یہ نسبت حضرت مولانا ممدوح کی بارگاہ میں میری بھی عزت کا باعث تھی۔

مولانائے ممدوح علی گڑھ کے مشہور دارالعلوم میں بحیثیت معلم دینیات اس زمانے میں ملازم ہوئے جب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں صاحب اس کے آنریری سکریٹری تھے، آپ کو علی گڑھ لانے والے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے، اس زمانہ میں دارالعلوم میں ممتاز علماء کا مجمع تھا، جن میں مولانا خلیل احمد اسرائیلی، مولانا عبداللہ انبیٹھوی، مولانا رشید احمد، مولانا عبدالحق حقی، شمس العلماء مولانا عباس حسین مجتہد، مؤخر الذکر نہ صرف شعبۂ دینیات کے معلم بلکہ ایم اے کو عربی کورس بھی پڑھایا کرتے تھے، انہوں نے بحالت ملازمت طویل عمر گزار کر علی گڑھ ہی میں انتقال کیا۔

مولانائے ممدوح کے تعلقات و روابط اپنے معاصرین سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں اور حکامِ دارالعلوم سے ہمیشہ خوشگوار رہے۔ ۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی بن جانے کے بعد جب مرحوم کا مرتبہ اور عہدہ دونوں بڑھ گئے تھے، اس میں کوئی فرق نہ آیا، اور وہ شعبۂ دینیات کے صدر اور لیڈر ہو گئے تھے۔ یونی ورسٹی کے سب سے پہلے وائس چانسلر مہاراجہ محمود آباد (محمد علی خاں صاحب) تھے، یہ خدمت عرصۂ دراز تک اعزازی رہی، اس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر اور ریاضی کے ماہر اور کیمبرج کے فاضل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پرو وائس چانسلر ہوئے۔''

پروفیسر سید سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بلاشبہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے، مگر ان کی

حیات مستعار کے کئی اہم گوشے اس تب وتاب کے ساتھ منظر عام پر نہیں آئے، جن کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

گوان کی دادو تحسین کا پورا حق ادا نہیں ہوسکا، پھر بھی اُن کے ہم عصر اہل علم و دانش اور بعد میں آنے والے صاحبان قلم نے کسی حد تک اُن کے علمی مرتبہ، روحانی درجات اور تدریسی و تحریری خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ اور بقول طالب ہاشمی، وہ علم و فضل کا بحرِ زخار اور ظاہری و باطنی خوبیوں کا پیکرِ جمیل تھے، ان کا وجود علی گڑھ یونی ورسٹی کے لیے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہزاروں تشنگانِ علم ان کے فیضانِ علمی سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر اپنے اپنے دوائر میں ان کے نام کو روشن کیا۔

اوپر دیا گیا اقتباس ہم نے اس طویل مضمون سے لیا ہے جو معارف کے ۱۲۴ تا ۱۳۶ کے صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ارض بہار اور مسلمان کے فاضل مولف عبدالرقیب حقانی، مولانا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''مولانا اشرف کے علمی مشاغل، خطابت، صوفی منشی، گھر کی مجلسیں، ان کے گرد مشاہیر کا مرجوعہ، علمائے ہند میں ان کا مرتبہ، ان کے کردار کا وقار، اپنوں کے ساتھ ان کی بے لوث محبت، غیروں کے ساتھ شفقت، ان کی حق بینی اور صداقت پسندی کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ حقیقت میں انہی خصوصیات نے مولانا کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز کر رکھا ہے۔ مولانا نے اپنا سب کچھ علی گڑھ کو دے رکھا تھا اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا تھا۔ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے صدر تھے۔ مولانا کا علم و عرفان مرجع خاص و عام تھا۔ یونی ورسٹی کے طلبا مولانا کی سادگی سے بہت متاثر تھے۔ مولانا کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان و پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے۔'' [1]

---

[1] ارض بہار اور مسلمان۔ علمی اکیڈمی فاؤنڈیشن، کراچی، طبع اوّل۔ ۲۰۰۴ء، ص ۴۲۳

آپ کے ایک نامور شاگرد جناب شبیر احمد خان غوری[1] مرحوم و مغفور ہیں کہ جن کی علمی وجاہت و ثقاہت کا زمانہ گواہ ہے۔ زندگی بھر معروف ترین درس گاہوں میں علم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ ابتدا آپ نے اپنی مادر علمی علی گڈھ یونی ورسٹی میں لکچرار کے طور پر کی تھی۔ آپ کی شخصیت پر اپنے عظیم استاد پروفیسر سید سلیمان اشرف کی چھاپ خاصی گہری تھی۔

سنیے وہ اپنے روحانی باپ یعنی استاد مکرم کے بارے میں کیا خوبصورت گفتگو کرتے ہیں۔

''اصل ''سلیمان اشرف'' وہ شخصیت نہ تھی جو آدم جی منزل میں قیام پزیر تھی اور جس کے آستانہ کی زیارت اکابر یونی ورسٹی اور وجوہ و اعیانِ شہر و ضلع علی گڑھ کے لیے موجب صد افتخار تھی۔ اصل ''سلیمان اشرف'' اس نابغۂ روزگار کی شخصیت تھی جو صحیح معنوں میں جامع الحیثیات، جامع العلوم اور جامع المنقولات والمعقولات تھا کہ اگر وہ طالبان حدیث کو علم حدیث نہ صرف درایۃً بلکہ روایۃً بھی پڑھاتے تو اُن کی درسگاہ محدثین سابقین کی مجالس کی مثیل و نظیر بن جاتی اور اگر وہ نحو کے شائقین کو فن نحو کی تعلیم دیتے تو اُن کی مجلس تعلیم ثمر[2] اور فراء کی مجالس علمیہ کی یادگار ثابت ہوتی، مگر بایں ہمہ جامعیت اُن کا نیز اُن کے اساتذہ کرام کے سلسلہ کا خاص فن وہ علم تھا جسے کسی اور اصطلاح کی غیر موجودگی میں معقولات

---

[1] آپ کے والد کا نام غیاث الدین خاں غوری ہے، ۱۵؍ مارچ ۱۹۱۱ء کو علیگڑھ میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، اردو، ریاضیات میں ایم اے کیا، اس کے علاوہ ایل ایل بی، منشی کامل اور درس نظامی سے عالم فاضل کیا اور ہر ایک امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء-۱۹۶۶ء، انسپکٹر آف اسکول اینڈ رجسٹرار عربک اینڈ پرشین اکزامینشنز کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۶۶ء-۱۹۷۲ء دہلی یونی ورسٹی میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے آپ نے درس دیا، ۱۹۷۲ء-۱۹۷۷ء اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علیگڑھ کے لٹریری ریسرچ یونٹ میں سینیر ریسرچ آفیسر کے عہدے پر مامور رہے۔ عربی ادب، اسلامیات، ہیئت، فلسفہ، ریاضیات آپ کے خاص موضوع ہیں۔ ان موضوعات پر تقریباً ایک ہزار خالص تحقیقی مقالات منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں عربی، فارسی کے ممتاز اسکالر کی حیثیت سے آپ نے صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ حاصل کیا۔ ۱۹۹۲ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے فخر الدین علی احمد غالب ایوارڈ سے آپ کو نوازا گیا۔ چند سال قبل علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔

[2] نحو کے ایک بڑے عالم کا نام جو ۲۱۰ھ میں پیدا ہوا اور ۲۶۰ھ میں فوت ہو کر بغداد میں مدفون ہوا۔

سے تعبیر کرنا مستحسن ہوگا۔ اگر اُستاد کی علمی جلالت قدر شاگرد کے علم و فضل کی تشکیل میں مؤثر ہو سکتی ہے تو یقیناً یہ طویل سلسلۂ اساتذہ بھی جس کا آغاز ایک جانب ارسطو و افلاطون بلکہ فیثاغورث و تالیس الملطی نے کیا تھا اور دوسری جانب امام ابوالحسن الاشعری اور اُن کے معتزلی و سُنّی اساتذہ بلکہ سیّدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے کیا تھا، ہمارے رئیس التذکرہ کو بھی سونے سے کندن بنانے میں بدرجۂ اولیٰ اثر انداز ہوا ہوگا۔'' [1] ؎

مولانا کے شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک علمی شخصیت ایسی ہے کہ ان کے تعارف کے لیے طویل صفحات درکار ہیں۔ اگر محض نام ہی لکھے جائیں تو اسمائے گرامی کی چکاچوند سے

---

[1] سہ ماہی مجلّہ اقبال (ادبیاتِ اردو نمبر) بزمِ اقبال، لاہور۔ جلد ۳۹، شمارہ ۲-۳: اپریل/ جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۹۳، مشمولہ، مضمون بعنوان مولانا سید سلیمان اشرف صاحب از شبیر احمد غوری

یہ مضمون راقم الحروف کو محترم و مکرم محمد خلیل احمد القادری البرکاتی، ریڈر، اے، کے طبیہ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ۱۹۹۰ء میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر ارسال فرمایا تھا۔ موصوف نے اس گرامی نامہ کے ساتھ بعض بیش قیمت نوادرات بھی عطا کیے۔ ان میں خاصے کی چیز مولانا سید سلیمان اشرف کی رہائش گاہ موسومہ آدم جی منزل پر نصب اس سنگ مرمر کی تصویر ہے جو آپ کے وصال کے بعد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی نے ازراہِ عقیدت نصب کروایا۔

۷۸۶

بیادگار

مولانا سیّد سُلیمان اشرف صاحب مرحوم و مغفور

صدر شعبۂ دینیات مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ متوطن بہار شریف (بہار)

جنھوں نے

تیس ۳۰ سال مُسلسل ''آدم جی پیر بھائی منزل'' کے اِس حصّے میں مستقل قیام فرمایا۔ اپنی حمیت دین، فضیلت علم، اصابت فکر اور ستودگی سیرت سے اس درسگاہ کو سر بلند رکھا اور سر بلند تر ہے

رہ روانِ شوق از ما سالہا آرند یاد
نقشہا انگیخت در راہِ محبت گامِ ما

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء (حسرت شروانی)

آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

حضرت کے رُوحانی گوشۂ زندگی پر نظر ڈالیں تو یہی نہیں کہ انھوں نے برگزیدہ ہستیوں سے اکتسابِ نور کیا۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس چراغ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی چراغ درخشندہ وتابندہ ہو کر منبع فیض بنے۔ صرف ایک مثال ہی شاید ہمارے اس نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہو۔

ولی الدین ولی (علیگ) مولانا عبیداللہ خاں دُرّانی کی سوانح حیات دُرِّ عینی میں علی گڑھ کے باب میں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ میں حضرت بابا محمد عبیداللہ[1] خاں درانی صاحب مولانا سلیمان اشرف صاحب کے پاس خصوصی عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے۔ بابا صاحب کا فرمانا ہے کہ ''مولانا سلیمان اشرف صاحب دن میں کٹر مولوی اور رات کو مست فقیر ہوتے تھے۔ ان سے میری اکثر رات کے وقت تنہائی میں ملاقات ہوتی۔ اُس وقت مولانا ایک مستی کے عالم میں ہوتے، مثنوی کے اشعار پڑھتے، گاتے،

....

[1] انجینئر محمد عبیداللہ خاں دُرّانی (معروف بہ بابا درانی) بن خان بہادر حبیب اللہ خاں درانی ۱۹۰۷ء میں جنوبی ہند کے شہر مدراس میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے انجینئرنگ الیکٹریکل میں 'بی ایس سی' کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ سے انجینئرنگ کی سند حاصل کی۔ جدید اور قدیم دونوں علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ پہلے آپ نے علی گڑھ کالج انجینئرنگ میں بحیثیت استاد خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۵ء میں پاکستان آگئے اور پشاور انجینئرنگ کالج میں الیکٹریکل ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین رہے۔ آپ نے ناگ پور کے حضرت بابا تاج الدین اور وزیانگرم کے حضرت بابا قادر اولیاء سے بھی بھرپور اکتساب فیض کیا۔ آپ ساری زندگی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سرگرم عمل رہے۔ آپ حد درجہ منکسر مزاج اور لوگوں کا دکھ بانٹنے والے انسان تھے۔ انھوں نے ہومیو پیتھک طریقہ علاج کو خلق خدا کی خدمت کا ذریعہ بنایا، وہ نہ صرف علاج مفت کرتے بلکہ ادویات بھی بلا معاوضہ تقسیم کرتے۔ ۱۰ر جون ۱۹۹۰ء کو آپ نے اس دار فانی کو خیر باد کیا اور قادر نگر نزد پیر بابا سوات میں مدفون ہوئے۔ سید محمد عبداللہ قادری اپنے مضمون دُرِّ عینی اور سید محمد سلیمان اشرف بہاری میں لکھتے ہیں کہ ولی الدین ولی کی بابا درانی صاحب سے علی گڑھ میں بھی دوستی تھی، پاکستان آکر اس میں مزید اضافہ ہوا۔ انہوں نے بابا درانی کو بہت قریب سے دیکھا اسی لیے وہ ایک اچھی سوانح حیات لکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ علی گڑھ میں بابا درانی صاحب کا ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاری سے بھی رابطہ رہا۔

جھومتے، رقص کرتے۔ ان کی یہ حالت ہی عجب ہوتی تھی۔" مولانا کا یہ انداز کہ 'اندر سے خسرو جیسا سوز اور باہر سے ہوشمندی و عقلمندی' ہمارے بابا جان کے رگ و پے میں سما گیا۔ مولانا کو بھی بابا صاحب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اکثر غالب یا مولانا رُوم کی مثنوی کے شعر سنانے کو کہتے۔ خود بھی شعر پڑھتے اور سر دُھنتے، عمامہ اتار ڈالتے، اور کھڑے ہو کر رقص کرنے لگتے۔ مولانا کی اس خصوصی کیفیت سے شناسائی بہت کم لوگوں کو ہوگی۔ مولانا سلیمان اشرف صاحب عوام کے سامنے ایک ماہرِ فن عالم، متقی، پارسا، شرع و آئین کی پابندی کا مجسمہ بن کر پیش ہوتے۔ دن کا سارا وقت درس و تدریس، عبادت، ریاضت میں صرف ہوتا۔ جب کبھی محفل میلاد ہوتی تو مولانا اپنی تقریر میں علم و عرفان اور عشق و محبت کا ایک دریا بہا دیتے۔ پھر جب سلام پیش ہوتا اور اس کے بعد قدم مبارک، موئے مبارک، کے تبرکات باہر نکالے جاتے تو حاضرین شاہد ہیں کہ محفل پر انوار کی بارش ہوتی۔ ملائکہ کا نزول ہوتا۔ سرکارؐ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی سواری تشریف لاتی۔ مولانا سلیمان اشرف کا یہ انداز کہ 'دن دنیا کا رات یار کی' بابا صاحب کی زندگی کا سرمایہ بن گیا۔"[1]

اب تک ہم نے صاحبِ کتاب کی ذاتِ ستودہ صفات کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ لیکن جب بات کتاب کی ہوگی تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دراصل علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے لیے مولانا کے مرتب کردہ نصاب تعلیم کی تفصیل ہی نہیں۔ اس بے مثال کارنامہ کے سلسلہ میں سید صاحب کی تگ و دو، راہ کی سنگلاخیاں اور پھر اُن کو بسر کر کے دُرِ مقصود کا حصول، یقیناً صبر آزما، مگر جاننے اور پڑھنے کی چیز ہے۔

آیئے ہم نقطۂ آغاز کے طور پر خود مولانا کے محبوب ادارے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں اُن کے اپنے شعبہ دینیات کے دورِ اولیں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

---

[1] دُرِّ یتیمی۔ سوانح حیات حضرت بابا محمد عبید اللہ خاں دُرّانی مولفہ ولی الدین، تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی، اشاعت دوم ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۴، ۱۲۵

مسلم یونی ورسٹی اور علوم اسلامیہ:

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے قیام (دسمبر ۱۹۲۰ء) سے قبل یعنی جب ابھی یہ ادارہ ایم۔اے۔ او کالج (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کہلاتا تھا، مولانا سید سلیمان اشرف وہاں علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت کے خواہاں تھے۔ چناں چہ ان مساعی کا ذکر کرتے ہوئے زیرِ نظر مجمل یادداشت میں وہ مسلم یونی ورسٹی اور اسلامک اسٹڈیز کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں۔

"......کالج ابھی یونی ورسٹی کے مرتبہ کو پہنچا بھی نہ تھا مگر مَیں نے اس کی بنیاد رکھنی شروع کر دی اور دو گریجوایٹوں کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ شعبہ منقول کی تکمیل صحیح استعداد کے ساتھ کریں چنانچہ سید عبدالرؤف پاشا مدراسی اور سیّد احمد شاہ پشاوری اس کے لیے آمادہ ہو گئے اور کام شروع ہو گیا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عین موقع پر ایک طوفان عظیم نان کوآپریشن کا آیا[1] جس میں ساری محنت نذرِ سیلاب ہو گئی۔ اب مسلم یونی ورسٹی قائم ہو گئی اور نان کوآپریشن کا زلزلہ اس تعلیم گاہ میں مائل بسکون ہونے لگا۔"[2]

مذکورہ بالا پیراگراف میں مولانا سید سلیمان اشرف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے اُن کی تڑپ اور لگن جوان کے دل میں ایک عرصہ سے موج زن تھی، کہ اسلامی مدارس اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں وہ کس قسم کے فارغ التحصیل طلبہ چاہتے تھے، نیز ہندوستان بھر میں کس پایہ اور فن کے اساتذہ دیکھنے کے آرزومند تھے، اس کا کچھ اندازہ ان کی درج ذیل تحریر سے ہو جاتا ہے، جو انہوں نے السبیل کی اشاعت (۱۹۲۴ء) سے کوئی دس سال قبل اپنے رسالہ البلاغ (مشمولہ مضمون: خلافت) میں کیا تھا۔ اس میں وہ مسلمانوں کے ماضی کا ذکر شاندار الفاظ میں کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ جب کوئی ملک یا سلطنت جہاں اہل اسلام کی عمل داری ہو، وہ علم کی دولت سے کس طرح مالا

....

۱۔ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

۲۔ سید سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: السبیل، طبع مسلم یونی ورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۹۲۴ء، ص ۲۶

مال ہوتا ہے..... اور پھر سن ستاون (۵۷) کے ہنگامہ کے بعد (مسلمانوں کی سلطنت چھن جانے سے) جو علمی اِدبار یہاں آیا، اس سے ان کے دلی کرب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ دیکھیے:

مسلمانوں کا تابناک ماضی:

"یہ امر مسلّم ہے کہ جس ملک میں اپنی سلطنت ہو اور اُس کے ساتھ ہی دشمنوں کے حملے سے امن ہو، اپنے میں قوۃ و طاقت جہانداری کی ہو، تو پھر علم و فضل سے وہ ملک آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔

جرمن و فرانس و انگلینڈ جو موجودہ زمانے میں ترقی کر رہے ہیں اُس کی بُنیاد اپنی سلطنت کا وجود ہے۔ خود مسلمان ایامِ ماضیہ میں جب کہ دیار و امصار کو فتح کر رہے تھے تو اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے اقلام علوم و فنون کو فتح کرتے جاتے تھے۔ بے شمار علوم اُن کے عہد سلطنت میں ایجاد ہوئے۔ کتنے مردہ فنون میں عربوں نے جان ڈالی۔ دُور کیوں جایئے۔ ہندوستان ہی کو لیجیے اور اُس کے اُس عہد پر نظر ڈالیے جب کہ سلطنت جا چکی ہے مگر اُس کا اثر ہنوز باقی ہے۔ صرف اثر کے وجود نے ایسے ایسے علماء و کُملاء پیدا کیے کہ آج اُن کے کلام کا سمجھنا فضلائے اجل کے لیے موجب افتخار ہے، مگر افسوس جب کہ علومِ مغربی نے اپنا سکہ جمایا۔ اور اپنی سلطنت علومِ اسلامیہ کی حمایت کے لیے باقی نہ رہی، تو پھر کیا حالت جہالت و بے علمی کی ہوئی۔ تم خود دیکھ لو وہی ہندوستان ہے، مگر کوئی شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبد العزیزؒ کا رتبہ حاصل نہیں کرتا۔ وہی سرزمین ہے، لیکن کوئی فضل حق و بحر العلوم[1] پیدا نہیں ہوتا[2]۔

---

[1] عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی، مولانا (۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء - ۱۲ رجب ۱۲۳۵ھ/۱۴ اپریل ۱۸۲۰ء)

[2] ہمارے مدارس جو صدیوں سائنس دان، طبیب اور ارباب علم و دانش پیدا کرتے رہے، آج اتنے بانجھ کہ ان کے پالے معاشرہ پر بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔ "اب برِ عظیم کے مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ اور علامہ فضل حق خیر آبادی ایسے نابغہ روزگار اور دیدہ ور نہیں..... مسلمانوں کی عربی و فارسی سوادِ دینی معمولات کی ادائیگی کے اور کسی کام کی نہ رہی۔" (فاروق القادری، سید، اصل مسئلہ معاشی ہے، طبع اوّل، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵-۳۶)

حالاں کہ مطابع کی کثرت اور کتابوں کی ارزانی ہے[1]۔ ایک چھوڑ پانچ یونی ورسٹیاں قائم ہیں۔ پچاس برس سے تعلیم پوری سرگرمی سے جاری ہے۔ ولایت بھی بکثرت کھیپ مسلمانوں کی جاتی ہے، اور ہزاروں صرف کر کے سندیں بھی لا رہی ہے، لیکن کوئی ان میں سے علوم مغربی کا ویسا ماہر نہیں ہوتا جیسا کہ اب سے سو برس پیشتر علومِ مشرقی کے اساتذہ کامل الفن پائے جاتے تھے۔ یونی ورسٹی سے ڈگری حاصل کر لینا اور ہے اور فن کا عالم و ماہر ہونا چیزے دیگر۔

دہانِ یار گجاؤ زبانِ سوسن گو
نہ ہر گلے کہ بخند و مقرری داند[2]

الستبیل کا پس منظر:

محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی[3] اپنے مراسلہ (مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۶۵ء از علی گڑھ، بنام پروفیسر رشید احمد صدیقی) میں مولانا سیّد سلیمان اشرف مرحوم کی تصنیف 'السبیل' (طبع ۱۳۴۲ھ/

۱۔ حضرت کی یہ دردمندی اور دل سوزی لگ بھگ صدی بھر پہلے کی ہے۔ ہم اپنے عہد کو کیوں کر لائیں کہ مطالعہ اور کتب بینی سے دُوری قوم کا عمومی چلن ہے۔ رہی سہی کسر ٹیلی ویژن اور کیبل اس چکا چوند نے نکال دی ہے۔ (ناشر)

۲۔ محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: البلاغ، طبع مطبع احمدی، علی گڑھ، ۱۹۱۴ء، ص ۳۶

۳۔ جناب محمد مقتدیٰ خاں شروانی ۱۸۸۰ء میں معروف شروانی پٹھان خاندان کے ایک علم پرور گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محمد مستجاب اللہ خاں مقبول ادیب اور میرزا داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پریس کی اردو مطبوعات پر یہ عبارت برسوں تواتر سے چھپتی رہی..... باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی..... آج بہت کم لوگ ہوں گے، جو اس نابغۂ روزگار شخصیت کی بے مثال صلاحیتوں، عہد آفریں خدمات اور ناقابلِ فراموش علمی و ادبی کاوشوں سے آگاہ ہوں۔
مرحوم کو خاندانی زمین، جائداد سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ قلم کے آدمی تھے اور زندگی بھر اُسی کے ہو کے رہے۔ لکھنے کا شوق انہیں لاہور لے گیا، جہاں منشی محبوب عالم کے روزانہ پیسہ اخبار کے ادارۂ تحریر سے منسلک ہو گئے۔ مشہور خبر رساں ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس کے بطور نامہ نگار ان کی وابستگی چودہ برس تک رہی۔ ۱۹۰۹ء کے آخری مہینوں میں وہ لاہور سے علی گڑھ واپس آ گئے، ان کا تقرر بحیثیت ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ہوا۔ بقول شروانی صاحب ..... مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم کا تقرر بھی ان کے ساتھ (یعنی ۱۹۰۹ء میں) علی گڑھ کالج میں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۱۹۲۴ء) کی اشاعت کے تعارف یا پس منظر میں لکھتے ہیں۔

''لارڈ کرزن[1] کی تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ یونی ورسٹی قائم ہوئی، تو وہاں 'اسلامک اسٹڈیز' کے نام سے ایک خاص شعبہ جاری ہونا قرار پایا۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں اس کی نقل علی گڑھ میں کرنی چاہی، اور مولانا (سلیمان اشرف صاحب) سے اس کے نصاب وغیرہ کی

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

بحیثیت استاذ دینیات عمل میں آیا۔

۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پریس کے شروانی صاحب مہتمم مقرر ہوئے، تو آپ نے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تبدیلیاں متعارف کرائیں۔ پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف نے اپنی کتاب ''المبین'' کی عمدہ طباعت پر انہیں تمغہ سے نوازا۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر منعقدہ اُردو کانفرنس اور مسلم پریس کانفرنس کی مجالس استقبالیہ کے صدر یہی محمد مقتدیٰ خان شروانی تھے۔

مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب وتدوین میں مقتدیٰ خان مولوی صاحب کے دست راست تھے، جس کا اعتراف خود مولوی سید احمد نے کیا ہے۔ اخباری مضامین کے علاوہ آپ کی تحریریں مختلف جرائد کی زینت بنتی رہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ جمعہ ۶ر دسمبر ۱۹۶۸ء بعمر ۸۸ برس، یہ عظیم انسان راہی ملک عدم ہوا، اور علی گڑھ میں ہی آسودۂ خاک ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

[1] لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی تجویز پر ۱۹ر جولائی ۱۹۰۵ء میں بنگال اور آسام دو صوبوں میں منقسم ہو گئے:
(۱) مشرقی بنگال اور آسام جس کا دارالحکومت ڈھاکہ قرار دیا گیا اور (۲) مغربی بنگال جس کا دارالحکومت کلکتہ رکھا گیا۔ مشرقی بنگال اور آسام کے نئے تشکیل شدہ صوبے میں آسام اور سابقہ صوبہ بنگال کے مندرجہ ذیل اضلاع شامل تھے۔

(۱) ڈھاکہ (۲) میمن سنگھ (۳) فرید پور (۴) باقر گنج (۵) تیپرہ (۶) نواکھالی (۷) چٹگام (۸) چٹگام کے پہاڑی علاقے (۹) راجشاہی (۱۰) دیناج پور (۱۱) جلپائی گڑی (۱۲) رنگپور (۱۳) بوگرہ (۱۴) پبنا (۱۵) مالدہ

.....دو (۲) بنگالوں کے بارے میں طوط فریزر لکھتے ہیں کہ

''نئے صوبہ کا رقبہ (۱۰۶۶۴۰) ایک لاکھ چھ ہزار چھ سو چالیس مربع میل پر مشتمل تھا اور آبادی ۳ کروڑ تھی۔ اس میں سے ایک کروڑ ۸۰ لاکھ مسلمان تھے اور ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ہندو، مسلمان کا غلبہ تھا محض اس حقیقت کی بنا پر کہ وہ مشرقی بنگال میں بلحاظ تعداد غالب اکثریت کے حامل تھے۔ وہ مستقل طور پر تقریباً افلاس زدہ ہیں اور ہندو کی غلامی میں پھنسے ہوئے۔''

(پاکستان منزل بہ منزل از سید شریف الدین پیرزادہ طبع کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۹۶، ۹۷)

فرمائش فرمائی۔ مولانا نے وضاحت چاہی۔ اس حیص بیص کے دوران میں
صاحبزادہ صاحب اپنی میعاد ممبری انڈیا کونسل پوری کرنے کے لیے ولایت چلے
گئے۔ نواب مزمل اللہ خان قائم مقام ہوئے۔ اس عبوری عہد میں 'الستبیل' یونی ورسٹی
کے صرف سے چھپی۔ چوں کہ ابہام میں اعتراضات تھے۔ صاحبزادہ صاحب کو
بہت ناگواری ہوئی جس کی تفصیل طول کلام ہے۔''

'الستبیل' کے مذکورہ بالا تعارف کے ساتھ اگر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں پر لکھے جانے والے مضمون از ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری (جو سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ، دوسرا کارواں میں شائع ہوا ہے) سے درج ذیل اقتباس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے، تو مزید دل چسپی اور معلومات کا موجب ہوگا۔ ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں۔

''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ ترقی کر کے ۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی بنا۔ اس
کے پہلے وائس چانسلر مہاراجہ محمود آباد (محمد علی خاں صاحب) مقرر ہوئے۔ ان کا عہد یکم
دسمبر ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر آخر فروری ۱۹۲۳ء کو ختم ہوتا ہے۔ آپ کے بعد صاحب
زادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ آپ کا زمانہ یکم جنوری ۱۹۲۴ء سے ۳۱ر
دسمبر ۱۹۲۶ء تک رہا۔ مہاراجہ صاحب کے وائس چانسلر شپ سے استعفیٰ کے وقت
صاحبزادہ صاحب انگلستان میں تھے۔ آپ ستمبر ۱۹۱۷ء سے ۳۱ر اگست ۱۹۲۴ء تک
انڈیا کونسل کے رکن رہے اور اس حیثیت سے آپ کا قیام زیادہ تر لندن میں ہی رہا۔
وہیں آپ کو وائس چانسلر شپ پیش کی گئی۔ آپ ستمبر ۱۹۲۳ء میں انڈین کونسل کی ممبری
کی میعاد پوری کر کے انگلستان سے واپس آئے، تو ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۳ء کو یونی ورسٹی کورٹ
کی میٹنگ میں صاحبزادہ صاحب کو وائس چانسلر منتخب کر لیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو
آپ نے چارج لیا۔ یونی ورسٹی کو صحیح اور صحت مند خطوط پر چلانے کے لیے آپ نے
اصلاح کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور اُسے ''کونسل'' کے سامنے پیش کیا۔ اور اس کی

منظوری ملنے پر عملی اقدامات کیے۔ اسی دوران آپ کو انڈین کونسل کے ممبر کی حیثیت سے پھر انگلستان جانا پڑا۔ اس طرح تقریباً پانچ ماہ (۲۲؍اپریل ۱۹۲۴ء تا وسط ستمبر ۱۹۲۴ء) آپ علی گڑھ سے باہر رہے۔ اس عرصہ میں نواب سر محمد مزمل (مزمل اللہ) خاں شروانی[1] نے قائم مقام وائس چانسلری کے فرائض انجام دیے۔"[2]

آگے چل کر ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب وسط ستمبر ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ واپس آئے۔ اور پھر وائس

---

[1] نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی بن حاجی غلام احمد ۱۸۶۱ء میں اپنے آبائی قلعے بھیکم پور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے دادا حاجی محمد داؤد خاں ریاست بھیکم پور کے رئیس تھے۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ محمد یار خاں اودھیوں کے عہد حکومت میں افغانستان سے ترک وطن کر کے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ افغانستان میں شروانی دراصل اس قصبے کا نام تھا، جہاں اس خاندان کی نمود ہوئی تھی، اور اسی باعث یہ پورا خاندان جس کے آثار علی گڑھ اور اس کے گرد و نواح میں اب تک موجود ہیں، شروانی کہلایا جاتا رہا ہے۔ مزمل اللہ خاں مرحوم نے بہت کم سنی میں علوم مشرقی سیکھے اور اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں عبور حاصل کر لیا اور گھر ہی پر انگریزی زبان سیکھی۔ وراثت میں ملی جائداد میں، اپنے تدبر، حسن انتظام اور پیش بینی سے استحکام بخشا اور توسیع کی۔ اپنے آبائی مسکن کے قریب ہی، ظفر منزل کے نام سے قلعہ تعمیر کرایا۔ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میں مزمل منزل کی داغ بیل ڈالی، جو اپنی وسعت، پائین باغ اور فن تعمیر کی دل کشی کی وجہ سے جاذب نظر تھی۔ سرسید سے قریبی تعلق رکھتے تھے، اور ایم، اے، او کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل کیے گئے۔ میونسپل بورڈ کے برسوں صدر رہے۔ ایک عرصے تک اسپیشل مجسٹریٹ درجہ اول کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۰ء میں یوپی گورنمنٹ کی طرف سے ہوم ممبر شپ کی تقرری اور علی گڑھ یونی ورسٹی کی وائس چانسلری ان کے لیے دو بڑے اعزاز تھے۔ نواب صاحب بغایت مخیر انسان تھے۔ مسلم اور غیر مسلم تعلیمی ادارے بلا تخصیص ان کی مالی امداد سے مستفید ہوتے رہے۔ مسلم یونی ورسٹی کے علاوہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، دارالمصنفین اعظم گڑھ، میواتی ہائی اسکول گڑگاؤں، اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ، اسلامیہ کالج سکندرہ راؤ، مسلم ہوسٹل الہ آباد یونی ورسٹی، مسلم گرلز کالج علی گڑھ، سٹی ہائی اسکول علی گڑھ، مدرسہ اسلامیہ چھپرہ، کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ اور گاندھی شفاخانۂ چشم علی گڑھ کو ان کی سرپرستی حاصل رہی۔ نواب صاحب کو شعر و ادب کا بھی ذوق تھا۔ ان کا فارسی دیوان بہ عنوان "اداے فصاحت" صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے پریس سے ۱۹۴۱ء میں باہتمام طبع کرا کر شائع کیا تھا۔ نواب صاحب مرحوم کا انتقال ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ میں ہوا۔

[2] ماہی فکر و نظر علی گڑھ۔ خصوصی شمارہ ۱۹۸۶ء، مشمولہ مضمون بعنوان صاحبزادہ آفتاب احمد خاں از ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری ص ۲۰ تا ۳۰ و ۲۱ تا

چانسلر شپ کے کاموں میں منہمک ہو گئے...... آپ نے ان تمام اصلاحی منصوبوں پر از سر نو غور کیا اور اپنی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے سب سے پہلے شعبۂ علوم اسلامیہ (Department of Islamic Studies) کی طرف توجہ کی اور اسے اپنی اصلاحی تحریک کا نقطۂ آغاز بنایا۔ ویسے اس کی ابتدا صاحبزادہ صاحب کے انگلستان روانہ ہونے سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ شعبۂ علوم اسلامیہ کے سربراہ مولانا سیّد سلیمان اشرف تھے۔ مولانا زبردست عالم دین اور غیر معمولی صلاحیت کے انسان تھے۔ آپ کا شمار اکابر قوم میں ہوتا تھا۔ اس موقع پر صاحبزادہ صاحب کا آپ سے براہ راست ٹکراؤ ہوا۔ ظاہر ہے مولانا جس مرتبہ اور حیثیت کے آدمی تھے ان کے لیے یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی کہ کوئی شخص بھی ان کے شعبہ کے معاملات میں مداخلت کرے۔ لہٰذا صاحبزادہ صاحب کی دخل اندازی پر ان کا ناراض ہونا بالکل فطری امر تھا۔ چناں چہ مولانا نے یونی ورسٹی میں علوم اسلامیہ اور عربی زبان کی تعلیمی صورت حال سے متعلق ایک طویل نوٹ تیار کیا۔ اور کتابی شکل میں ''السبیل یعنی مجمل یادداشت متعلق اسلامک اسٹڈیز مسلم یونی ورسٹی'' کے عنوان سے شائع کر دیا۔ یہ ۱۹۲۴ء میں اُس وقت شائع ہوا جب صاحبزادہ صاحب انگلستان گئے ہوئے تھے۔ یہ قائم مقام وائس چانسلر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب شروانی کے حکم سے شائع ہوا، اور اس پر قائم مقام وائس چانسلر کے علاوہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین، صدر یار جنگ نواب محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور جناب فخر الدین، وزیر تعلیم صوبۂ بہار اور اُڑیسہ کی آراء بھی شامل تھیں، جن میں اس یادداشت کو سراہا گیا تھا اور اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا گیا تھا۔

''السبیل'' یونی ورسٹی میں علوم اسلامیہ کی صورت حال سے متعلق محض ایک

یادداشت ہی نہیں تھی بل کہ اس میں مولانا نے شعبۂ علوم اسلامیہ کی کارکردگی کی صفائی بھی پیش کی تھی اور وہ بھی اس انداز میں جس سے صاحبزادہ صاحب پر الزام عائد ہوتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کو انگلستان سے واپسی پر اس کا علم ہوا، اسے دیکھ کر انھیں احساس ہوا کہ حالات کو آسانی سے انھیں (نہیں) سُدھارا جا سکتا۔ انھیں اس بات کا بھی افسوس ہوا کہ وائس چانسلر کے خلاف یہ رسالہ یونی ورسٹی کی جانب سے شائع ہوا۔[1]

یہاں ایک بات کا خاص طور سے ذکر ضروری ہے۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی[2] نے خاکہ ''ڈھونڈھو گے انھیں'' میں سابق ناظم دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ مولانا محمد تقی امینی (۵ رمئی ۱۹۲۶ء-۲۱ رفروری ۱۹۹۱ء)، جن کا تقرر ۱۹۶۴ء میں ہوا کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سلیمان اشرف کے دور کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> مولانا محمد تقی امینی جب تک مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ سُنّی دینیات سے وابستہ رہے برصغیر میں اس شعبے کا بڑا وقار تھا۔ مولانا محمد تقی امینی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ روز اوّل ہی سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی انتظامیہ نے ان کو تقریر و تحریر کی وہ ''آزادی'' دے رکھی تھی جو شاید ہی کسی مدرسے کے صدر مدرس یا مفتی کو حاصل ہوتی ہو۔ ان کو ان حالات سے بھی گزرنا نہیں پڑا جن سے مولانا سلیمان اشرف گزرے تھے۔ جو حضرات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں ان کو یاد ہوگا کہ مولانا سلیمان اشرف صدر شعبۂ سُنّی دینیات اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر میں اس حد تک اختلاف ہو گیا تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے

---

[1] سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ خصوصی نمبر ۱۹۸۶ء (نامورانِ علی گڑھ) ص ۴۷ اور ۵۷

[2] ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (۱۶ رنومبر ۱۹۳۴ء - ۷ رجنوری ۲۰۱۳ء) شعبۂ علوم اسلامی (مسلم یونی ورسٹی) میں مطالعات علوم ایرانی کے ریڈر تھے۔ تحقیق و تنقید کے علاوہ شعر و شاعری کی طرف بھی توجہ کی۔ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف/مرتب/مترجم ہیں۔ ڈیڑھ سو کے قریب آپ کے علمی و تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

کے خلاف کتاب تک شائع کردی تھی[1]۔ مولانا تقی امینی کو ایسے حالات سے نہیں گزرنا پڑا۔ یونی ورسٹی نے ان کی زبان اور قلم کو کھلی آزادی دے رکھی تھی جو ان کو اپنی ملازمت کے آخری دن تک حاصل رہی[2]۔

تاریخ اسلام یا مسلمان حکمرانوں کی تاریخ:

السبیل کے آخر میں تاریخ اسلام کے لیے جو نصاب تعلیم برائے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی تجویز کیا گیا ہے اس کی افادیت تو مسلمہ ہے......لیکن مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی (م: ۳۱ر مارچ ۱۹۸۲ء) کا یہ تجزیہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے......

ہماری تاریخ میں چند بڑی بنیادی غلطیاں ایک عرصے سے چلی آرہی ہیں۔ پہلی غلطی تو یہ ہے کہ لکھتے ہیں صرف فرماں رواؤں اور حکمرانوں کی تاریخ، اور نام رکھتے ہیں اس کا "تاریخِ اسلام" یعنی ان کے نزدیک اسلامی تاریخ نام ہے صرف فتوحات وحکمرانی کا۔ اس میں آپ کو ہر بدکردار اُموی، عباسی، فاطمی، بویہی اور سلجوقی کا ذکر ملے گا۔ اور جن لوگوں کا ذکر آپ نہ پائیں گے وہ ہیں شیخ عبدالقادر

---

1. ہمارے پیش نظر یہ مطبوعہ مواد نہیں ہے، لیکن حقائق وقرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس سلسلہ میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے غالباً ایک دوسرا کتابچہ "مسلم یونی ورسٹی کی موجودہ حالت" کے عنوان سے نظامی پریس، بدایوں سے چھپوا کر شائع کیا (۱۹۲۷ء)، اس سے پہلے ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو ایک ضخیم پمفلٹ شائع کیا تھا، جس میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اور مولانا سلیمان اشرف مرحوم پر سخت اعتراض کیے اور یونی ورسٹی کے عام حالات پر بھی شدید نکتہ چینی کی۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک پمفلٹ شائع کیا......ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری اپنے مضمون 'صاحبزادہ آفتاب احمد خاں' میں سیاسی نظریات کے تحت لکھتے ہیں۔ 'صاحبزادہ صاحب نیشنلسٹ خیالات کے انسان تھے۔ اور عمومی طور پر کانگریس کی پالیسیوں سے اتفاق کرتے تھے۔ اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وہ سر سید کے خیالات سے نہ صرف اختلاف کرتے تھے بلکہ ان پر معترض بھی تھے۔ اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔' (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سہ ماہی فکر ونظر، علی گڑھ۔ خصوصی نمبر ۱۹۸۶ء، صفحات ۷۷، ۷۸، ۸۱ اور ۱۵۷)
2. ڈھونڈو گے انہیں (خاکے)، قرطاس کراچی۔ بار اوّل ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۴

جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل، علامہ ابنِ حزم، علامہ ابنِ جوزی۔ گویا یہ لوگ اسلامی تاریخ میں داخل نہیں، حالانکہ یہ لوگ اسلام کے ستون اور اسلامی اقدار کے زبردست محافظین میں ہیں۔ ان کے تذکروں کے لیے الگ الگ تاریخ الصوفیہ، تاریخ الائمہ اور تاریخ الفقہا تو لکھی جائے، لیکن تاریخِ اسلامی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ آپ کی تاریخ کیسے اسلامی تاریخ ہو گئی؟ زیادہ سے زیادہ تاریخ المسلمین ہوسکتی تھی۔ وہ بھی نہیں بلکہ تاریخ الامراء والملوک ہوسکتی ہے، نہ کہ تاریخِ اسلام۔ طبری نے صحیح نام رکھا "تاریخ الامم والملوک"۔ ابن کثیر نے بھی ٹھیک نام رکھا۔ البدایۃ والنھایۃ۔ لیکن یہ جو "تاریخ اسلام" کے نام سے مختلف کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ نام ہماری رائے میں محلِ نظر ہیں۔[1]

تاریخ کی کتب میں الفخری کا مقام:

استنبول میں شعبۂ تاریخ اسلام (Islamic History) میں یونی ورسٹی کے طلبہ کے لیے بنوامیہ اور بنوعباس کا عہد مقرر کیا گیا ہے اور ساتھ انہیں اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ اس کے لیے وہ کتاب الفخری[2] اور مقدمہ ابن خلدون کے چوتھے، پانچویں اور آٹھویں باب کا مطالعہ کریں......

---

[1] پھلواروی، محمد جعفر شاہ، مولانا۔ اردو ترجمہ: الفخری (گزارش مترجم)، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔ باردوم ۲۰۰۷ء، ص ۱۵و۱۶

[2] کتاب "الفخری" (تالیف: محمد بن علی بن طباطبا معروف بہ ابن طقطقی) کا پورا نام الفخری فی الاداب السلطانیۃ والدول الاسلامیۃ ہے۔ پہلی بار مطبعۂ رحمانیہ مصر سے ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں چھپی، ۷۰۱ھ میں لکھی گئی، جب کہ ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء کے آغاز میں عباسی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ الفخری کا شمار معتبر ماخذ میں ہوتا ہے۔ فی الواقع اختصار کے باوجود ایسی جامع تاریخ پہلے نہیں لکھی گئی۔ تاریخ الملوک والامم (طبری) اس سے پہلے اور البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) اس کے بعد کی ہے۔ تاہم الفخری کا امتیاز برقرار رہتا ہے۔ الفخری کے مولف کی ایک خوبی حدِ کمال کو پہنچتی نظر آتی ہے۔ وہ نہ تو کسی کے عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے اور نہ ہی کسی کے ہنر کے اعتراف میں بخل سے کام لیتا ہے۔ وہ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واقعات کو بیان کرتا ہے، خواہ کوئی ان حقائق کی زد میں آئے یا اُسے فائدہ پہنچے۔ اردو میں الفخری کا پہلا ترجمہ ۱۹۶۲ء میں مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی نے کیا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ اس سے پہلے مسٹر سی۔ ای۔ جے۔ وائٹنگ

(باقی بر صفحہ آیندہ)

بلا ریب یہ دونوں عہد امت مسلمہ کی تاریخ ہیں، اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خلافت بنی اُمیہ (۶۶۱-۷۵۰ء) اور خلافت عباسیہ (عہد بنو عباس: ۷۵۰-۱۲۵۸ء) دونوں پر غور کرنے سے اُن کے انداز میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت کے قائم ہونے سے صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ حکومت ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان میں چلی گئی۔[1]

خلافت راشدہ کب سے کب تک؟

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد عالیہ کے مطابق، خلافت راشدہ[2] یا اسلامی حکومت محض تیس برس تک محیط رہی، جو زیادہ سے زیادہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مختصر ترین عہد سمیت بنتی ہے۔[3] گویا تاریخ اسلام، اعلان نبوت کی تاریخ سے خلافت

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

نے کیا، جو ۱۹۴۸ء میں لندن سے شائع ہوا۔ کتاب میں تسلسل ہے۔ اپنی مخصوص ترتیب ہے، لطائف ہیں، ادبی شہ پارے ہیں، حکمرانوں کے لیے ضروری آداب کی تربیت ہے۔ کتاب کا مواد، اس کے نام سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، جو مولف کے مزاج کی پختگی اور حسنِ ذوق کی دلیل ہے۔

۱۔ چراغ حسن حسرت۔ تاریخ اسلام طبع لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۵ و ۱۹۳

۲۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے یکے بعد دیگرے پہلے چار جانشین جو سُنّی مسلمانوں میں خلفائے راشدین (خلیفہ بمعنی نائب اور راشد: نیک) کے لقب سے موسوم ہیں اُمت کی اکثریت کے نزدیک ذاتی طور پر اسلامی تعلیمات کے مثالی پیرو اور مسلم معاشرہ و ریاست کو اسلامی خطوط پر چلانے والے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا (۶۳۲-۶۶۰ء) جب مسلمانوں نے جزیرہ نمائے عرب کی حدود سے باہر نکل کر آس پاس کے ممالک میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور اٹھارہ (۱۸) سال کی قلیل مدت میں مشرق میں ترکستان تک اور مغرب میں شمالی افریقہ کے وسط تک کے وسیع علاقے پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ خلافتِ راشدہ کے آخری دس (۱۰) برسوں میں مسلمانوں کے مابین خانہ جنگی نے فتوحات کا سلسلہ روک دیا......'' (فاروقی، عمادالحسن۔ ''دنیا کے بڑے مذہب'' ص ۳۴۲)

۳۔ ''خلافت کا یہ دورِ اولین جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر ختم ہوا خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ ان بزرگوں نے کمال نیک نفسی و پابندی شرع سے دین الٰہی کی خدمت کی اور چونکہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے خلفائے راشدین کی پیروی کرو۔ لہٰذا یہ پانچوں محترم جانشینان حضیر نبوت مسلمانوں کے عقیدے میں خلفائے راشدین تسلیم کیے گئے''۔ (شرر، مولوی عبدالحلیم۔ مضمون: ۱۹۲۰ء (تاریخ خلافت)، مشمولہ۔ شمع حرم مرتبہ فاروق عثمان، ڈاکٹر۔ طبع بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۲۱ و ۲۲۲)

راشدہ کے اختتام تک کل ۵۲ برس کے تذکرے کا نام ہے، ورنہ اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ تو یقیناً ہے، تاریخ اسلام کہلانے کی شاید مستحق نہ ہو[1]۔ یہ واقعہ ہے حقیقت ہے اس سے انکار کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔ اس لیے پیش نظر رسالہ میں مولانا سلیمان اشرف توجیہ[2] و تعلیل[3] اسلامی تاریخ کے تحت رقمطراز ہیں۔

''اسلام کی تاریخ فی الحقیقت اسی چالیس برس پر صادق آتی ہے اس کے بعد اقوام مسلم کی تاریخ ہے...... سلطنت کے ساتھ نبوت کی شان ہر حرکت وسکون میں جہاں نمایاں اور تاباں ہے وہ صرف آغاز نبوت سے ۳۰ ہجری تک ہے[4]۔

اسلامی تاریخ کا شعبہ انگریزی میں قائم ہو چکا ہے اس لیے بالفعل اسی کی

....

۱ منہاس، مختار جاوید: ''میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند؟'' لاہور۔ تحریک حسن عمل پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۲

۲ توجیہ۔ چہرے کے خط وخال، حلیہ (۲) سبب کا اظہار کرنا، باعث بتانا، وجہ بیان کرنا یا بتلانا، دلیل لانا، سامنے کرنا

۳ تعلیل۔ سبب نکالنا، وجہ بیان کرنا یا بتانا (۲) دلیل لانا

۴ مولانا سلیمان اشرف نے اپنے رسالہ البلاغ میں اس کا ایک جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''خلفائے اربعہ کا زمانہ جس جامعیت کا زمانہ تھا، اس کی نظیر تو کیا اس کے لگ بھگ بھی کوئی عہد تم کو نہ ملے گا۔ بنو امیہ کا دور شروع ہوتے ہی دربار خلافت علم باطن سے محروم ہو گیا۔ تزکیۂ نفس وتصفیہ روح جس کے انوار ائمہ اہل بیت میں پاؤ گے، خلفائے بنو امیہ میں اس کا پتا ملنا دشوار۔ پھر آگے چل کر دولت علم سے بھی بارگاہ خلافت مفلس ہو گئی۔ اب صرف جہاں گیری وجہاں داری رہی...... یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جیسے جیسے دربار خلافت سے جامعیت حذف ہوتی گئی ما بقیہ چیزوں میں رہنا یا دوسری جانب متوجہ ہونے لگی۔ یہیں سے سلطنت کی حکومت اور مذہب کی حکم رانی الگ الگ ہو گئیں۔'' (البلاغ، ص ۲۳، ۲۴)

البلاغ پہلی مرتبہ ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ سو سال تک یہ قیمتی رسالہ نایاب ہونے کی وجہ سے اہل علم کی دسترس سے باہر رہا۔ بالآخر ادارۂ پاکستان شناسی نے عالی قدر ڈاکٹر وحید عشرت (سابق ڈپٹی ڈائریکٹر اقبال اکادمی، لاہور) کے گراں قدر دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ ماہنامہ قومی زبان اور ماہنامہ کاروان قمر کراچی۔ سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد اور ماہنامہ معارف رضا، کراچی نے اس پر سیر حاصل تبصرے کیے۔ ''البلاغ'' دو مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے کا عنوان 'مسلمانوں کا ملی انحطاط' اور دوسرا مقالہ 'اسلام اور خلافت' کے ذیلی عنوانات: اسلام اور تمدن، اسلام اور سیاست، اسلام اور حرب، خلافت اور پانچ مفید ہدایات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر دلاور خاں کے بقول...... یہ مقالہ اسلامی سیاسیات پر اتنا وقیع ہے کہ جامعات کے شعبۂ سیاسیات کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے تاکہ سیاسیات کے طالب اسلامی سیاست کے روشن خدوخال سے آگاہ ہو سکیں۔

مطابقت و موافقت سے عربی میں اسلامی تاریخ کا دور بنو اُمیہ[1] اور بنو عباس مقرر کیا اگر چہ آیندہ چل کر آغاز اسلام سے ۳۰ ہجری تک کا واقعہ نصاب میں داخل کرنا ہوگا"۔[2]

مستشرقین کے گمراہ کن اعتراضات حقائق کی روشنی میں:

عام کتب تاریخ کے مرتبین چوں کہ اصل مأخذ و مراجع سے استفادہ کر نہیں پاتے اس لیے مولانا سلیمان اشرف نے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ قارئین کرام تاریخ اور سیر کے اصل مأخذ سے رجوع کریں۔ اس سے جہاں طالبانِ علم میں ذوق تحقیق پیدا ہوگا وہیں بعض مستشرقین کے بے جا اعتراضات کی حقیقت بے نقاب ہوگی کہ انھوں نے محض تعصب کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس کو نشانہ بنایا ہے۔ چناں چہ وہ رقمطراز ہیں۔

"یورپ کے بعض متعصب مصنفین نے جو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کیے ہیں اُن کا صحیح جواب اور ان کے اعتراض متعصبانہ کی اصل حقیقت محققانہ

....

[1] "بنو اُمیہ کی حکومت (۶۶۱-۷۵۰ء) خاندانی بنیاد پر قائم تھی اور اُن کے نظامِ سلطنت میں عرب نسل کو دوسری قوموں پر فوقیت حاصل تھی۔ بنو اُمیہ کے حکمران اپنے طرزِ حکمرانی میں اسلامی تعلیمات کے بجائے اقتدار کی مصلحتوں کو سامنے رکھتے تھے اور اگر چہ انھوں نے کبھی اپنے کو اسلام کا علم بردار ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی، پھر بھی وہ خود اور عرب قوم جس کی وہ ترجمانی کرتے تھے مذہب اسلام کی پیرو تھی۔" (فاروقی، عمادالحسن آزاد۔ "دنیا کے بڑے مذہب"، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۴۳)۔ "ادھر شام میں جناب معاویہؓ نے رومی رعایا کو اپنا غلام بنایا اور اُن کی قوت کے برتے پر علم بغاوت بلند کر دیا اور حضرت علی کی شہادت کے بعد جب عنان خلافت بھی اُن کے ہاتھ میں آ گئی، تو انھوں نے اپنے دربار میں رومی کر و فر کی نقل اُتار کے خلافت اور جانشینی رسول اکرم کو پوری پوری شہنشاہی بنا دیا۔ اب خلافت کا فقط نام تھا۔ دراصل یہ عربوں کی شہنشاہی تھی جس کا سریر شہریاری ارض عرب سے نکال کے ملک شام میں بچھایا گیا تھا، جس پر بیٹھنے والا اور اُس کے گرد ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے والے عرب تھے۔ مگر وہی عرب جو وطن سے نکل آئے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کے رہنے والوں نے یہ رنگ دیکھا تو اس عربی سلطنت سے علاحدہ ہو کے اپنے اسی قدیم مذاق پر آ گئے۔ وہی قبائل کے شیوخ کی سرغنائی قائم ہو گئی جس کو اُس بیرونی سلطنت سے بہت ہی کم سروکار تھا، مگر حدود عرب کے باہر ایک عربی شہنشاہی قائم تھی جو مشرق سے مغرب تک سیکڑوں ملکوں پر حکومت کر رہی تھی۔" (عبدالحلیم شرر، مولوی۔ مضمون: 'سال اُنیس سو اُنیس مبارک باشد' مشمولہ۔ شمع بزم (ترتیب و تدوین: ڈاکٹر فاروق عثمان)، ص ۲۱۴)

[2] السبیل، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۴ء، ص ۵۹

طور پر جب ہی معلوم ہوسکتی ہے جب کہ سیرت اور تاریخ کی مستند کتابیں عربی میں پڑھی جائیں۔

عربی میں اس شعبہ کی تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ طلبہ میں ذوق تحقیق پیدا ہو۔ انگریزی مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے اُسے اصل مأخذ میں جب پڑھیں گے تو واقعات کے صحت وسقم کی تنقیح عالمانہ اور مجتہدانہ طرز پر کرسکیں گے یہ شعبہ بہت وسیع ہے سلاطین، علما اور علم ان سب کی تاریخ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ بالفعل ۲۶ء کے لیے تاریخ میں الفخری (الفخری، اصولِ ریاست اور تاریخِ ملوک) اور فلسفۂ تاریخ میں مقدمہ ابن خلدون کا باب چہارم، پنجم اور ششم مقرر کیا گیا ہے''۔[1]

سیّد صاحب بہ حیثیت ماہر تعلیم:

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بہاری جہاں ایک قادر الکلام مقرر، دُور بین محقق، صاحب طرز ادیب، ایک عظیم مدبر اور بہترین معلم تھے، وہیں آپ کی حیثیت بطور ماہر تعلیم مسلّم تھی۔ ۲۶-۱۹۲۵ء میں جب علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی میں میٹرک سے لے کر ایم اے تک کے شعبہ دینیات کے لیے نصاب مرتب کرنے کی ضرورت پڑی، تو نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی میں دیگر ماہرین تعلیم میں آپ بھی شامل تھے۔ نصاب کے مرتبین اور اس کی کمیٹی کی کارکردگی کا ذکر سیّد سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڈھ میں اس طرح کیا ہے:

''منتظمین یونی ورسٹی کی دعوت پر چند ایسے علماء جو جدید ضروریات سے آگاہ اور نصاب ہائے تعلیم اور درس گاہوں کا تجربہ رکھتے تھے، علی گڈھ میں جمع ہوئے اور (۱۹۲۶ء میں) متواتر سات اجلاسوں میں جو ۱۱ر فروری سے ۱۷ر فروری تک منعقد ہوتے رہے، مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھا، اور اس کے لیے ایک نقشۂ عمل اور ایک نصاب میٹرک سے ایم اے تک کا تیار کر کے یونی ورسٹی کے سامنے

---

[1] الستہلال، ص ۵۹

پیش کر دیا۔ اس مجلس کے ارکان حسبِ ذیل اصحاب تھے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سلیمان اشرف صاحب صدر علوم مشرقیہ مسلم یونی ورسٹی، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی استاد دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، مولانا امجد علی گھوسوی (مصنف بہار شریعت) صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر، اور خاکسار (سلیمان ندوی)، مولانا عبدالعزیز صاحب میمن راجکوٹی استاد ادبیات عربی مسلم یونی ورسٹی نے بھی خاص خاص موقعوں پر شرکت کی۔ علوم مشرقیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، عقلیات، دینیات اور ادبیات اور ہر ایک کا علاحدہ علاحدہ نصاب ترتیب دیا گیا ہے، جو ایف، اے کے پہلے سال سے ایم، اے تک ختم ہو جائے گا''۔[1]

سیّد سلیمان اشرف اور ندوۃ العلماء:

شاید بعض حضرات کے لیے یہ بات چونکا دینے والی اور ایک خبر کی حیثیت رکھتی ہو کہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف جو مولانا شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کمال درجہ ارادت رکھتے تھے، وہ ندوۃ العلماء کے بھی خاصے قریب رہے اور اس کی سرگرمیوں کو بہ نظر استحسان دیکھا کرتے تھے۔ جب کہ امام احمد رضا عقاید کے باب میں ندوی علماء سے زبردست اختلاف[2]

---

[1] شذراتِ سلیمانی، حصہ دوم۔ دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (بھارت) ایڈیشن اوّل، ۱۹۹۷ء، ص ۶۱ بحوالہ ماہنامہ معارف، فروری ۱۹۲۶ء

سیّد سلیمان اشرف بہاری۔ حیات و کارنامے (از) محمد علی اعظم خاں قادری۔ دہلی، بار دوم، ۲۰۰۸ء ص ۶۹-۷۰ (بحوالہ سید سلیمان ندوی۔ شذرات، معارف اعظم گڈھ، فروری ۱۹۲۶ء)

[2] ''ندوۃ العلماء کی بنیاد جس اصول پر رکھی گئی تھی اُس سے مقاصد تعلیم زمانہ حال کے مطابق علیٰ وجہ الکمال پورے ہوتے تھے علماء اہل سنت کا اختلاف نظام تعلیم سے نہ تھا یہ مسئلہ تو متفق علیہ تھا۔ ندوہ نے تکملہ علوم عربیہ و دینیہ کے ساتھ تعلیم انگریزی بھی داخل نصاب کی تا کہ اس مدرسہ کا فارغ التحصیل طالب العلم اگر انگریزی تعلیم حاصل کیا چاہے تو پانچ برس میں گریجوایٹ ہو جائے۔ ندوۃ العلماء کے سند یافتہ اس وقت ملک میں موجود ہیں اُن کی لیاقت و

(باقی بر صفحہ آیندہ)

رکھتے تھے، ایک سے زیادہ ثقہ روایات شاہد ہیں کہ پروفیسر صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے باقاعدہ کسبِ فیض کیا۔[1] اور شاید اسی تعلق خاطر کے باعث، کئی مواقع پر ندوۃ العلماء میں برپا ہونے والے جلسوں میں پورے اہتمام کے ساتھ شرکت کی، بلکہ ان تاریخی اجتماعات سے خطاب بھی کیا۔[2]

تحریک ترک موالات اور مدرسوں کے فتاوٰی:

گزشتہ صفحات میں مولانا سلیمان اشرف نے جس سیلاب اور عظیم طوفان کا ذکر کیا ہے، اس سے ان کا اشارہ تحریک ترک موالات یا عدم تعاون (Non Cooperation Movement) کی طرف تھا، جب بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف حقوق کے نام پر آزادی اور تحریکِ خلافت وغیرہ کے نام سے جو تحریکیں چلنے لگیں، تو مسلمانوں کی اجتماعی اور دینی زندگی سے متعلق کئی طرح کے مسائل پیدا ہوئے۔ ان مسائل میں (۱۹۲۰ء میں) مسئلہ ترکِ موالات سرفہرست تھا۔ فتوے جاری ہوئے کہ مسلمان اپنے بچوں کو اسلامیہ کالجوں وغیرہ میں پڑھانا چھوڑ دیں۔ مذکورہ تحریک کے جذباتی اور ہنگامی

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

فضل کا ثبوت اُن کی مصنفہ کتابوں سے ملتا ہے۔'' (محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا۔ ''النور''، مطبع مسلم یونی ورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۷ و ۱۹۸)۔ ''اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اس ادارے نے لٹریچر کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس نے ایسے افراد پیدا کیے جو تحریر و تقریر کی بہترین صلاحیتوں سے مزین تھے۔ اس نے اسلامی تہذیب و تمدن پر بیش بہا کتابیں اردو زبان میں مہیا کیں جن سے قوم کے اندر بیداری آئی اور مغرب پر علمی تنقید سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ بالخصوص اسلامی تاریخ، سیرت اور مختلف اسلامی علوم پر اس ادارے کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔'' (عبید اللہ فہد فلاحی، ڈاکٹر۔ ''تاریخ دعوت و جہاد۔ برصغیر کے تناظر میں''۔ ادارہ معارف اسلامی، لاہور۔ طباعت سوم ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۱)

[1] ریاض الرحمٰن خاں شروانی، سابق پروفیسر کشمیر یونی ورسٹی (بھارت) اپنے ایک مضمون بعنوان ''مفتی عبداللطیف'' میں ندوۃ العلماء میں مفتی صاحب مرحوم (۱۸۷۱ء۔ دسمبر ۱۹۵۹ء) کے شاگردوں کی فہرست میں مولانا سید سلیمان ندوی اور سید سلیمان اشرف کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں (سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء، تا دوران علی گڑھ۔ تیسرا کارواں (جلد دوم)، ص ۱۲۵)۔ نیز دیکھیے: ششماہی نقطۂ نظر: اسلام آباد شمارہ ۲۷ بابت اکتوبر ۲۰۰۹ء۔ مارچ ۲۰۱۰ء

[2] روداد اجلاس نوزدہم (۱۹) ندوۃ العلماء منعقدہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ رشعبان ۱۳۴۳ھ مطابق ۸، ۹، ۱۰ رمارچ ۱۹۲۵ء، بمقام لکھنؤ، میں چھپی اہم شرکاءِ اجلاس کی فہرست میں سید صاحب کا اسم گرامی بارھویں نمبر پر درج ہے۔ (تاریخ ندوۃ العلماء، حصہ دوم از مولوی محمد اسحاق جلیس تمریز خاں۔ بار اول ۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸)

دور میں جمعیت العلماء ہند کے راہنما اور بعض دوسرے لیڈر تحریک ترک موالات کو کامیاب بنانے کی غرض سے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ[1]، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور کو بند کرانا چاہتے تھے۔

ترک موالات کا نشانہ، علی گڑھ یونی ورسٹی:

معین الدین احمد ندوی، حیاتِ سلیمان (جو سید سلیمان ندوی کے سوانح حیات پر تالیف کی گئی ہے) میں تحریک ترک موالات اور مسلم یونی ورسٹی کے باب میں مذکورۂ بالا صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نان کواپریشن کی تاریخ میں سرکاری درس گاہوں کی تعلیم کا بائی کاٹ[2] اور آزاد قومی درس گاہوں کا قیام بھی شامل تھا، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور گاندھی جی وغیرہ نے علی گڑھ کالج پر دھاوا کیا، ملک کا اعتدال پسند طبقہ تعلیمی بائی کاٹ کے خلاف تھا لیکن علی گڑھ کے طلبہ کی ایک جماعت نے جس میں طلبہ اور (بعض) اساتذہ دونوں شامل تھے اور آزادی کے جوش سے زیادہ معمور تھے، کالج چھوڑ دیا اور کالج کے ارباب حل وعقد نے کچھ دنوں کے لیے کالج

---

[1] ''ہندو لیڈروں کو یہ بات نہ بھاتی تھی کہ اِکا دُکا مسلمان بھی کسی سرکاری عہدہ پر نظر آئے، مگر کچھ بس نہیں چلتا تھا، کہ جس یونی ورسٹی (یا کالج وغیرہ) کی بدولت مسلمان تعلیم پا کر کچھ اسامیاں پُر کر لیتے تھے، اس کو بند کرا سکیں۔ تحریک ہٰذا (ترک موالات) میں ان کو یہ موقع مل گیا اور انھوں نے انگریزی تعلیم کے بائیکاٹ پر زور دیا۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کو تعلیم پانے سے روکنے کی تجویز منظور کی۔ لیکن اس میں کیا راز مضمر تھا، صرف یہی کہ علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی کو توڑ دیا جائے تاکہ ہندوستان میں کوئی واحد مسلم درس گاہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور باوجود ے کہ تعلیمی بائیکاٹ کا حکم عام تھا۔ ہندو یونی ورسٹی پر آنچ نہ آنے دی گئی۔'' (فاروقی، محمد مشتاق حسین۔ ''مسلمان اور کانگریس۔ اتحادِ مسلم ومشرک پر شریعت اسلام کا حکم مبین''، مطبوعہ مراد آباد سنہ ندارد، ص ۳)

[2] ''مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ کو بند کرنے اس کا بائیکاٹ کرنے کے لیے مولانا محمد علی جوہر نے زور لگایا، لیکن خدا بھلا کرے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کا کہ انھوں نے مسلم یونی ورسٹی کو سنبھالے رکھا۔ بنارس یونی ورسٹی جس کے کرتا دھرتا پنڈت مدن موہن مالوی (مالویہ) تھے انھوں نے کسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ ان میں ہندو ذہنیت کام کر رہی تھی۔'' (شیر کوٹی، محمد انوار الحسن، پروفیسر مولانا۔ ''خطبات عثمانی''، نذر سنز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۷۲ء، ص ۲۱-۲۲)

بند کر دیا، اس سے کالج کو کچھ نقصان ضرور پہنچا مگر وہ ٹوٹنے سے بچ گیا، گاندھی جی اور مولانا محمد علی علی گڑھ کالج میں تو ایک حد تک کامیاب ہو گئے لیکن پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو یونی ورسٹی کے احاطہ میں کسی کو قدم نہ رکھنے دیا۔" [1]

تحریک عدم تعاون کی آڑ میں مسلم درس گاہوں کو کیوں نشانہ بنایا جانے لگا اور اس کی ابتدا ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے کی گئی۔ ذیل میں ہم تحریک ترک موالات اور علی گڑھ کے حوالے سے مزید اس کا تذکرہ کریں گے۔ تحریک ترک موالات کے دور میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جناب عشرت علی قریشی (سابق ڈپٹی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) اپنے ایک تفصیلی مضمون "ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد" میں تحریک ترک موالات کا حملہ کے تحت یوں رقم طراز ہیں۔

"......کالج ابھی اس سنگین صورت حال سے پوری طرح نکل نہ پایا تھا کہ دوسرے ہی سال اسے ایک اور سخت بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تھا تحریک ترک موالات کا حملہ۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی برادران مع گاندھی جی علی گڑھ آئے [2]۔ چند دن کے بعد ہی خلافت تحریک کے دوسرے رہنما بھی علی گڑھ پہنچ گئے، جن میں کالج کے ممتاز ٹرسٹی اور اولڈ بوائز مثلاً حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، نواب محمد اسمٰعیل خاں، تصدق احمد خاں شروانی وغیرہ شامل تھے۔ ممتاز علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا آزاد سبحانی بھی تشریف لے آئے تھے۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے ان رہنماؤں کی کوشش یہ تھی کہ علی گڑھ کالج اس تحریک میں مرکزی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لے۔ چنانچہ ان کا

---

[1] حیات سلیمان مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ (بھارت) ۲۰۱۱ء، جدید ایڈیشن، ص ۲۲۵

[2] چناں چہ شیخ الہند (مولانا محمود حسن صاحب، صدر مدرس دار العلوم دیو بند) کے فتویٰ ترک موالات کی اشاعت کے بعد ہی مولانا محمد علی جوہر وغیرہ علی گڑھ وارد ہوئے۔ تاہم (اور جیسا کہ اوپر گزر چکا) مسلمانوں کی جذباتی رو کے برعکس "مجموعی طور پر علی گڑھ یونی ورسٹی متحدہ قومیت اور ترک موالات کے سیلاب کی زد میں آنے سے محفوظ رہی اور ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد ایک مرد آہن کی طرح اپنے راست موقف پر ڈٹے رہے۔" (محمد علی چراغ۔ "اکابرین تحریک پاکستان"۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۱)

مطالبہ تھا کہ کالج کے ارباب حل وعقد گورنمنٹ گرانٹ نامنظور کردیں اور کالج کا الحاق ختم کرلیں۔ تمام خطاب یافتہ ممبران اسٹاف اپنے خطابات واپس کریں۔ کالج سنٹرل خلافت کمیٹی کے تحت ایک قومی ادارہ بن جائے اور تمام نوجوان خلافت کے کام میں مصروف ہوجائیں اور اگر بورڈ آف ٹرسٹیز اور کالج سنڈیکیٹ ان تجاویز کو قبول نہ کریں تو پھر طلباء تعلیمی مقاطعہ کریں۔ ان تجاویز کو منظور کرنے کے لیے ۲۸ر اکتوبر تک کا وقت دیا گیا۔ بورڈ آف ٹرسٹیز اور کالج سنڈیکیٹ دونوں نے ان تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اولڈ بوائز کی ایک بڑی تعداد بھی ان تجاویز کی مخالف تھی۔ اور چاہتی تھی کہ کالج کو ترک موالات کی تحریک سے محفوظ رکھا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سو طالب علم مع ڈاکٹر ذاکر حسین کالج چھوڑ کر تحریک خلافت میں شامل ہوگئے۔ ان طلباء کی تعلیم کے لیے ۲۹ر اکتوبر کو نیشنل یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا افتتاح (۵ر نومبر ۱۹۲۰ء) مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم (اصلی نام محمود حسن ہے) نے بعد نماز جمعہ یونی ورسٹی کی جامع مسجد میں کیا۔ اولاً یہ نیشنل یونی ورسٹی کالج کے قریب ہی ایک عمارت میں شروع کی گئی، لیکن بعد میں اسے دہلی منتقل کردیا گیا اور یہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔" [۲]

---

[۱] حکیم اجمل خاں (۱۱ر فروری ۱۸۶۸ء۔ ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۷ء) امیر الجامعہ اور عبدالمجید خواجہ شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ جامعہ کے اصل بانی مولانا محمد علی، حضرت شیخ الہند اور حکیم اجمل خاں مرحوم تھے لیکن اس کے ارکان میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، اس زمانہ کے بہت سے ہندو لیڈر بھی شامل تھے۔ (دیکھیے: مضمون بعنوان مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں، مشمولہ "دلی اور طب یونانی" از حکیم سید ظل الرحمٰن۔ طبع اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۵ء، و "حیات سلیمان" از شاہ معین الدین احمد ندوی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء)

نوٹ: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مذکورہ ہندو لیڈروں کے عمل دخل کے بدولت جامعہ ملیہ کا ماہانہ ترجمان "جامعہ" نیشلسٹ دانشوروں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا، اس رسالہ میں انھیں اپنے نظریات پھیلانے کی کھلی چھوٹ تھی۔ چنانچہ ایک قوم پرست کانگریسی راہنما ڈاکٹر سید محمود نے اکبر کے "دین الٰہی" کا حوالہ دیتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کی متحدہ قومیت کا یہی مذہب ہونا چاہیے اور وطن کی مناسبت سے مسلمانوں کو اپنا کوئی اور نام اختیار کرلینا چاہیے۔ ("جامعہ" اکتوبر ۱۹۳۶ء، بحوالہ رازی "سوراجی اسلام"، ص ۹)

[۲] سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ۔ خصوصی نمبر (جلد ۲۳) ۱۹۸۶ء۔ نامورانِ علی گڑھ، دوسرا کارواں، ص ۱۵۳، ۱۵۴، مشمولہ مضمون بعنوان: 'ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد' از عشرت علی قریشی

تحریک ترک موالات کے اثراتِ بد، یونی ورسٹی پر:

تحریک ترک موالات (عدم تعاون) کے دور میں علی گڑھ یونی ورسٹی کو کن حالات سے گزرنا پڑا، صفحات گزشتہ میں آپ پڑھ چکے۔ بات نامکمل رہے گی اگر ہم آیندہ سطور میں ترک موالات کے سلسلہ میں یونی ورسٹی کمیشن کی رپورٹ (۱۹۲۷ء) کا ذکر نہ کریں...... صاحب زادہ آفتاب احمد خاں (م: ۱۸ر جنوری ۱۹۳۰ء) نے عہد وائس چانسلری میں، یونی ورسٹی کے متفرق شعبہ جات کی کارگزاری کی تحقیقات اور اس عظیم تعلیمی ادارہ میں اصلاحی تجاویز کی غرض سے ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو سکریٹری تعلیمات ہند کے نام ایک مراسلہ ارسال کیا، تو نواب سلطان جہاں بیگم (والیۂ ریاست بھوپال) نے مسلم یونی ورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے ۱۹۲۷ء میں ایک کمیشن مقرر کر دیا، جس کا بنیادی مقصد صاحبزادہ صاحب کے دور وائس چانسلری (یکم جنوری ۱۹۲۴ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۶ء) میں یونی ورسٹی اور اس کے مختلف شعبہ جات کی کارکردگی کی تحقیقات اور مذکورہ مراسلہ میں کی جانے والی شکایات پر کارروائی کرنے کے لیے سر ابراہیم رحمت اللہ (بمبئی) کی سربراہی میں کمیشن بنا دیا[1]۔ یہ

---

[1] متذکرہ بالا تحقیقاتی کمیشن کا مقرر کیا جانا، مسلم یونی ورسٹی کی تاریخ کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا، جس میں ساٹھ سے زیادہ شہادتیں قلم بند کی گئیں اور تیس سے بڑھ کر تحریری بیانات حاصل کیے گئے۔ کمیشن کا اصل محرک کیا تھا، اس کا ایک بڑا سبب تو وہی تھا کہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کو اس 'مجمل یادداشت متعلق اسلامک اسٹڈیز مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ' سے سخت اختلاف (اور یہ خلش ان کے دل میں برابر رہی) تھا۔ "المستقبل" میں یہ یادداشت شائع ہونے پر وہ مولانا سلیمان اشرف نیز ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (پرو وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی) کے خلاف اظہار خیال اپنے کتابچوں میں کر چکے تھے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (۱۵ر جون ۱۹۱۶ء ۔ ۷ر ستمبر ۱۹۹۴ء) سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، خود نوشت 'رفت و بود' میں کچھ اسی پس منظر میں لکھتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری یونی ورسٹیاں علمی اور تحقیقی مراکز ہونے کے باوجود سیاست کا شکار زیادہ رہی ہیں اور اب تو یہ رو بہت تیز ہو گئی ہے۔ جن لوگوں کا کام درس و تدریس اور تعلیم و تحقیق ہے وہ جوڑ توڑ میں زیادہ لگے رہتے ہیں۔ یہ عالم نہیں علم کے بیوپاری بلکہ بنجارے ہیں۔ علی گڑھ بھی اس قسم کی سیاست سے محفوظ تو نہ رہا البتہ اس کی سطح وہ نہیں رہی جو اب تک نظر آتی ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ علی گڑھ میں بیٹھنے والی تحقیقاتی کمیٹی یا کمیشن کا تھا۔ دراصل جھگڑا دو شخصیتوں

(باقی بر صفحۂ آیندہ)

کمیشن ''رحمت اللہ کمیشن'' کے نام سے مشہور ہوا۔[1] ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری (اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونی ورسٹی) لکھتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

اور دونوں (یعنی صاحب زادہ آفتاب احمد اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد) کے حامیوں کا تھا جس کی زد میں پوری یونی ورسٹی آ گئی تھی۔ مولانا (سلیمان اشرف) بھی ان لوگوں میں تھے جن پر خاص طور سے نظر تھی، سبب صاف ظاہر ہے۔ مولانا کھرے آدمی تھے اور کھرے بھی، لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے جو محسوس کرتے وہی کہتے اور برملا کہتے۔ رشید صاحب کا بیان ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے مولانا سے پوچھا۔ مولانا اب کیا ہونے والا ہے جواب رشید صاحب کی زبان سے سنیے:

''رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو، مجھے خیال تھا کہ تم اس قسم کا تذکرہ نہ چھیڑو گے، ہوگا کیا؟ وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔ مومن کی یہی شان ہے کہ اُس پر ہراس طاری نہ ہو، تم ڈرو گے تو اُن لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا تھا وہ ہو چکا ہے پھر ڈرنے اور جھجکنے سے کیا فائدہ۔'' مولانا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شہنشاہیت روما کا وہ عہد یاد آ گیا جب گالس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشہ میں آ کر سینیٹ کا رخ کیا جہاں ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست پر ہی ذبح کر دیا، لیکن کسی سینیٹر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ وزاری کی۔'' (رشت و بود۔ طبع کراچی ۲۰۱۱، ص ۱۱۷۔۱۱۸)

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مسلم یونی ورسٹی کے مذکورہ قضیہ کا ذکر ''گنجہائے گرانمایہ'' میں اپنے مشمولہ مضمون مولانا سلیمان اشرف میں قدرے تفصیل سے کیا ہے، جس سے مولانا کی ذات ستودہ صفات، عزم و استقلال اور استقامت کا کوہ گراں نظر آتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

آج کم و بیش دس گیارہ سال ہوئے، یونی ورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی، بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا خاص طور پر زد میں تھے، ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی، نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گزر چکا ہے۔ اس زمانہ میں مولانا کو دیکھا کیا مجال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آ جاتا۔ جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے ...... وہ دن گزر گئے، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا، مرحوم بھی جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ آج اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا۔ اس وقت صرف مرحوم کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔

[1] سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ۔ جلد ۲۳ خصوصی شمارہ ۱۹۸۶، ص ۷۹

کمیشن نے ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ میں اپنا کام شروع کیا۔ تقریباً ایک ماہ تک اس نے اپنا کام جاری رکھا اس عرصہ میں ۳۲ حضرات نے اس کے سامنے شہادتیں دیں۔ ان میں مہاراجہ محمود آباد، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، کرنل بشیر حسین زیدی، سجاد حیدر یلدرم (رجسٹرار) اور سر شاہ محمد سلیمان جیسی جلیل القدر شخصیات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ۶۱ حضرات نے تحریری بیانات داخل کیے ان میں سر راس مسعود، بابائے اردو مولوی عبدالحق، نواب ناظر جنگ بہادر، نواب صدر یار جنگ بہادر، سر اکبر حیدری، پروفیسر ہارون خاں شروانی، جناب عابد خاں شروانی رئیس بھیکن پور (علی گڑھ) جناب حاجی محمد عیسیٰ خاں، رئیس دتاولی (علی گڑھ) جناب حاجی محمد صالح خاں صاحب رئیس بھیکن پور (علی گڑھ) اور مولانا سلیمان اشرف وغیرہ شامل تھے۔

کمیشن نے تمام امور کا جائزہ لیا اور تحریری یادداشتوں میں جو سفارشات کی گئی تھیں ان پر بھی غور کیا۔ اور ۹/نومبر ۱۹۲۷ء کو بیگم بھوپال کی خدمت میں رپورٹ پیش کر دی۔ رپورٹ انگریزی میں ہے اور بڑے سائز کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ یونی ورسٹی اس وقت تنزل کا شکار ہے اور سر سید تحریک کی اصل روح تیزی سے مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عام طور پر یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ علی گڑھ کی سند، جو کسی زمانہ میں باعث افتخار سمجھی جاتی تھی بہت جلد اپنی وقعت کھو دے گی اور نااہلی کی دلیل بن جائے گی۔ رپورٹ کے الفاظ میں:

"The present discontents are deep and wide spread. It is admitted by witnesses almost without exception that the spirit and traditions of Aligarh are fast disappearing that grave and serious troubles have eaten into the life of the University, and there

is a fear that the possession of an Aligarh degree, once a credential, may become a disability." [1]

ڈاکٹر انصاری اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں۔

اس زبوں حالی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کمیشن نے لکھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ ملک میں تحریک عدم تعاون، یونی ورسٹی سے مسلمانوں کی عمومی عدم دل چسپی، شخصیات کا باہمی ٹکراؤ، یونی ورسٹی ایکٹ میں شدید قسم کے نقائص، قوانین کو شائع کرنے اور قواعد کو منضبط کرنے میں غیر ضروری تاخیر اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۹۲۰ء کے اختتام پر یونی ورسٹی کو عدم تعاون کی تحریک سے شدید نقصان پہنچا جب کہ قومی یونی ورسٹی قائم کرنے کے بہانے اسے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نہ تو کوئی تحریک اور نہ ہی کوئی حریف ادارہ زیادہ عرصہ تک اس پر اثر انداز ہو سکا؛ البتہ جو بات زیادہ دور رس نتائج کی حامل ہوئی وہ یہ ہے کہ اس تحریک کے نتیجہ میں بہت سے اچھے طلبا محض جذبۂ قربانی کے تحت یونی ورسٹی چھوڑ گئے اور متعدد ابنائے قدیم نے، جو کالج کے ٹرسٹی بھی تھے، یونی ورسٹی کے معاملات سے دل چسپی لینی چھوڑ دی۔ [2]

عصری تقاضوں سے بے بہرہ علما کی سرگرمیاں:

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ علی گڑھ کالج تو شروع ہی سے (تحریک کے ابتدائی دنوں میں مسلم یونی ورسٹی محض کالج تھی لیکن دسمبر ۱۹۲۰ء میں مکمل یونی ورسٹی بن گئی) مولانا محمود حسن صاحب (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء - ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء) اور ان کے ہم نوا علما کی نظر میں بری طرح سے کھٹکتا تھا اور ان کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح اس تعلیمی مرکز کو ڈھا دیا جائے۔ آخر تحریک ترک

---

۱ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ۔ جلد ۲۳، ۱۹۸۶ء، ص ۸۰ (بحوالہ مسلم یونی ورسٹی کی موجودہ حالت۔ ص ۳)

۲ سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ۔ جلد ۲۳، ۱۹۸۶ء، ص ۸۰

موالات کے دوران انہیں یہ موقع میسر آ گیا، تو انہوں نے اسلامیہ کالج علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنی دیرینہ خواہش کا یوں اظہار کیا:

> ''علی گڑھ کالج کی ابتدائی حالت میں علماء متدینین نے علی العموم اس قسم کی تعلیم سے (جو از سر تا پا گورنمنٹ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے) روکا مگر بدقسمتی کہ وہ رُک نہ سکی۔ اب جب کہ اس کے ثمرات و نتائج آنکھوں سے دیکھ لیے تو قوم کو اُس سے بچانا بالبداہت ایک ضروری امر ہے طلبہ کے والدین دیکھ بھال کر اور سمجھانے پر بھی اُسی تعلیم پر زور دیں اور مذہبی تعلیم سے مانع ہوں تو طلبہ کو ضروری ہے کہ لوجہ اللہ تعلیم مذہبی اور اسلام کی خدمت گزاری کے لیے سعی کریں۔'' [1]

چناں چہ پروفیسر انوار الحسن صاحب شیر کوٹی کے بقول...... طلبہ میں حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن صاحب) کے فتویٰ سے بہت جوش پیدا ہوا اور اکثر لڑکوں نے یونی ورسٹی کا بائیکاٹ کر دیا۔[2] گویا گاندھی جی کے مرتب کردہ پروگرام ترکِ موالات[3] پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ مولانا حسین احمد ''نقشِ حیات'' میں لکھتے ہیں۔ ''مہاتما گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔[4] حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کے متعلق طلباء یونی ورسٹی نے فتویٰ

---

1. ترکِ موالات پر علمائے کرام دیو بند، سہارنپور، فرنگی محل لکھنؤ، دہلی و بدایوں وغیرہ کے فتاوے، مطبوعہ میرٹھ ۱۹۲۰ء، ص ۴، مشمولہ ''تحریکات ملی تحریکات کے آئینے میں مسلمانانِ پاک و ہند کی سیاسی جدوجہد کی سرگزشت''۔ مجلہ علم و آگہی (خصوصی شمارہ ۸۳-۱۹۸۲ء) کراچی، گورنمنٹ نیشنل کالج، ص ۴۳۶
2. محمد انوار الحسن شیر کوٹی، پروفیسر مولانا ''خطباتِ عثمانی''، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء۔ حاشیہ ص ۳۸
3. 'کراچی کا تاریخی مقدمہ' (مرتبہ میرزا عبد القادر بیگ، شائع کردہ اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، طبع ۱۹۸۵ء) کے پیش لفظ میں محمد رضا انصاری لکھتے ہیں: 'عدم تشدد کے مبلغ مہاتما گاندھی تحریک خلافت اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں کے قائد بنے'...... نیز بقول موہن لعل (بھٹناگر) ایڈیٹر ''درپن''۔ 'مہاتما جی خلافت کے لیڈر اور خلافت کمیٹی کے رہبر بن گئے اور مسلمانوں نے مہاتما جی پر وہ اعتبار اور یقین دکھایا کہ دنیا دنگ رہ گئی'۔ (ماہنامہ ''درپن'' لاہور (کانگریس نمبر) دسمبر ۱۹۲۲ء، جلد ۱ شمارہ ۷، ص ۲۲۶)
4. 'چنانچہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے گاندھی کی رہنمائی میں ہندوستان کا دورہ کر کے پورے ملک کو ترکِ موالات کے نعروں سے پر شور کر دیا'۔ (معین الدین احمد ندوی، شاہ۔ ''حیات سلیمان''، ص ۱۸۱)

حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ (محمود حسن صاحب) نے ترکِ موالات کی تمام دفعات[1] میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلباء یونی ورسٹی کو زور دار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔'' [2]

جدید علوم میں مسلمانوں کی پس ماندگی:

متحدہ ہندوستان میں مسلمان خود تعلیمی لحاظ سے کس قدر پس ماندہ تھے۔ مولانا سید سلیمان اشرف نے مذکورہ دور کے ہندو اور مسلم تعلیمی تناسب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف تین کالج ہیں علی گڑھ، لاہور اور پشاور۔ اس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس (۱۲۵) ہے تین مسلمانوں کے اور ایک سو بائیس (۱۲۲) ہندوؤں کے ان میں سے اگر سرکاری کالجوں کو جن کی تعداد کل چونتیس (۳۴) ہے الگ کر لیجیے جب بھی اٹھاسی (۸۸) کالج خاص ہندوؤں کے رہ جاتے ہیں ان میں بائیس (۲۲) کالج ایسے ہیں جس (جن) میں گورنمنٹ کی امداد قطعاً شامل نہیں اور چھیاسٹھ (٦٦) ایسے کالج ہیں جن میں گورنمنٹ کی امداد جاری ہے تین اور اٹھاسی کی نسبت ذرا غور سے ملاحظہ کیجیے۔ پھر تعلیم کے ملیامیٹ کر دینے کا فیصلہ کیجیے۔

سارے کالجوں میں مجموعی تعداد ہندوستانی طلبہ کی چھیالیس ہزار چار سو سینتیس (۴٦۴۳۷) ہے جن میں سے مسلمان طلبہ چار ہزار آٹھ سو پچھتر (۴۸۷۵)

---

[1] انڈین نیشنل کانگریس نے یہ دفعات ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں اپنا ایک خصوصی اجلاس منعقد کر کے حکومت سے ترکِ تعاون کا رزولوشن پاس کیا تھا، اس کے تین مہینہ کے بعد دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگ پور میں کانگریس کا جو سالانہ تاریخی اجلاس ہوا، اُس نے بھی اس رزولوشن کی تصدیق کی۔ ازاں بعد موالاتی علما نے کانگریس کے پروگرام پر اپنے فتاویٰ کے ذریعہ مہر تصدیق ثبت کی۔ (ملاحظہ ہو: ''متفقہ فتوے مرتبہ جمعیۃ مرکزیہ علمائے ہند، مشمولہ'' کراچی؛ تاریخی مقدمہ'' (مرتب) میرزا عبدالقادر بیگ، شائع کردہ کراچی سٹی پریس، ۱۹۹۹ء)

[2] حسین احمد مدنی، مولانا۔ ''نقشِ حیات'' جلد دوم۔ بیت التوحید، کراچی سنہ ندارد، ص ۱۷۳

ہیں، ہندو طلبہ کی تعداد اکتالیس ہزار پانچ سو باسٹھ (۴۱۵۶۲) ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہندو چوبیس (۲۴) کروڑ اور مسلمان سات کروڑ ہیں......

جس قوم کی تعلیمی حالت یہ ہو کہ سات کروڑ میں سے صرف چار ہزار مشغول تعلیم ہوں اُس قوم کا یہ ادّعا اور ہنگامہ کہ اب ہمیں تعلیم کی حاجت نہیں اگر خبط وسَودا نہیں تو اور کیا ہے۔" سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

"رائے بے طاقت مکر و فسون ست　　وطاقت بے رائے جہل و جنوں"

(النور، مطبوعہ مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۱۳۳۹ھ، ص ۱۹۶۔۱۹۷)

تحریک ترکِ موالات اور مولانا کی بصیرت:

الغرض مولانا سلیمان اشرف نے اپنی تصنیف النور (۱۹۲۱ء) میں مسئلہ ترکِ موالات (نان کوآپریشن)، مسئلۂ خلافت اور مسئلۂ تعلیم پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے[1] اور اس تحریک کے مضمرات سے آگاہ کیا ہے۔ مذکورہ نازک اور پُر فتن دور میں آپ نے اسلامیانِ ہند کو بلاخوف لومۃ لائم مشرکینِ ہند (کانگریس) کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کے خطرناک نتائج سے آگاہ کیا[2] اور علما کو ان کی ملّی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی

---

[1] مسئلۂ ترکِ موالات کی ماہیت جاننے..... نیز تحریک خلافت و ترکِ موالات پر کام کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔ پروفیسر اختر راہی کے بقول..... "النور" تحریک خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے دور کے مباحث کو سمجھنے کے لیے ایک بنیادی مأخذ ہے۔ تاریخ کے اس باب کو محفوظ کرنے کے لیے النور اور آپ کا دوسرا رسالہ ارشاد (طبع علی گڑھ، ۱۹۲۰ء) سید نور محمد قادری اور راقم الحروف کے مقدمات کے ساتھ لاہور سے شائع ہو چکے ہیں۔

[2] ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ خطرناک اتحاد، مسٹر گاندھی کی تحریک خلافت کی حمایت کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ تحریک خلافت، تحریک ترکِ موالات کی اساس تھی، تحریک ترکِ موالات کے دوران میں گاندھی جی کی جانب سے تحریک خلافت کی جس انداز میں حمایت کی گئی، مسلمانوں نے سمجھا کہ گاندھی جی اسلام کے اس ستون کی حمایت کر رہے ہیں حالاں کہ ایسا نہیں تھا۔ جو شخص اسلام ہی کا مخالف ہو وہ خلافت تحریک کی حمایت کیسے کرے گا؟ پروفیسر احمد سعید کے بقول "ہندوستانی تاریخ کا یہ پہلا اور آخری دور تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج کو

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

پہنچا اگر چہ یہ بہت مختصر دور تھا...... لیکن باایں ہمہ ترکِ موالات (یہ تحریک ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر اٹھائی) کے جو تباہ کن دور رس اثرات مرتب ہوئے، اس سے تو کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ متذکرہ دور کے عینی شاہد سید نذیر نیازی (۱۹۰۰ء۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۸۱ء) نے اس کا اظہار 'اقبال کے حضور، شائع کردہ، اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور (جو ان کی ایک بیاضِ یادداشت مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۸ء تا ۲۱ر مارچ ۱۹۳۸ء پر مشتمل ہے) میں متعدد مقامات پر کیا ہے، مثلاً رقم طراز ہیں۔

(۱) ہندو اور سکھ تو اس تحریک (ترک موالات) کے بعد اپنی صفیں مضبوط کر چکے تھے۔ مسلمان البتہ طرح طرح کی جماعتوں میں منقسم، روز بروز انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو رہے تھے۔

(۲) یہ جو کچھ ہے پچھلے چند سالوں سے ہماری ناکام قیادت کا نتیجہ بلکہ سچ پوچھیے تو تحریکِ ترکِ موالات کے خاتمے سے جو انتشار رونما ہوا اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

(۳) (ترکِ موالات میں) قانون شکنی سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ خلافت کی ناکامی سے مسلمانوں میں جو انتشار پھیلا...... اس تحریک کی ناکامی کا ایک بہت بڑا سبب تو یہ تھا کہ اس کی زمامِ قیادت گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی، جس میں ان کے مخصوص مذہبی تصورات۔ ستیا گرہ اور اہنسا۔ کام کر رہے تھے۔

(اقبال کے حضور۔ طبع پنجم ۲۰۱۲ء، حواشی ص ۱۲۲، ۱۹۳ و ۲۶۳)

اسی طرح ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنی کتاب 'اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ اور جدید دنیائے اسلام۔ مسائل، افکار اور تحریکات' میں وطنی قومیت کا مسئلہ کے باب میں نیشلسٹ علماء کا ذکر کیا ہے، جو جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے سرگرم عمل رہے اور وہ ہندو مفاد کے لیے مسلسل کام کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں۔ 'جمعیۃ العلمائے ہند نے کانگریس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ مسلم لیگ کو زک پہنچانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے اور لیگ کی مخالف مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کانگریس نے اپنی سرپرستی میں ایک 'شعبۂ اسلام' قائم کیا، جس کے لکھنؤ اور الٰہ آباد میں دو دفاتر بنائے گئے یہاں سے اپنے ہم خیال مسلم علماء سے ایسا ادب وافر مقدار میں تحریر کرایا گیا، جو مسلمانوں میں قومیت اور سیاست کے تعلقات سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سبب بنا۔ کانگریس نے اپنے بے پناہ وسائل استعمال کیے اور سرمایہ خرچ کیا۔ چنانچہ اس کے خیالات اور نظریات مقدس اور محترم ہستیوں کی زبانوں سے بھی اسی طرح ادا ہوئے جس طرح گاندھی اور نہرو ادا کرتے۔ اس صورت حال میں سادہ لوح مسلمانوں کا ایک طبقہ فریب کی زد میں آ گیا کانگریس کو اپنے مقاصد میں اس حد تک کامیابی ضرور ہوئی کہ علماء کا ایک طبقہ بھی اس کے نظریات و مقاصد سے متفق ہو کر اس کی

(باقی بر صفحہ آئندہ)

(۱۸۹۶ء-۱۹۷۷ء) سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'گنجہائے گرانمایہ' میں تحریکِ ترکِ موالات میں مولانا سلیمان اشرف کے مُرتسم انمٹ نقوش کا ذکر بڑے دل نشیں پیرایہ میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے، نان کوآپریشن (Non-Cooperation) کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے، 'گائے کی قربانی' اور 'موالات' پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اُس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہی سب کچھ ہے، یہی باتیں ٹھیک ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی۔ کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم مطعون ہو رہے تھے، لیکن نہ چہرہ پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق...... کہتے تھے۔ 'رشید! دیکھو، علما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا کیسا گھر گھروندا بنا رکھا ہے'۔ میری سمجھ میں اُس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں۔ بالآخر مولانا نے ان مباحث پر قلم اُٹھایا اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہتے۔ اکثر مجھے بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ میں کہتا۔ 'مولانا! میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ میں مُحاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہوں گے'۔ کہتے۔ 'یہ بات نہیں ہے۔ تم پر اس ہڑ گم کا اثر نہیں ہے اور سمجھتے ہو کہ یہ سیکڑوں علما جو کہتے ہیں، وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی یوں ہی کہتا ہوں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

تحریک میں شامل ہو گیا اور لاشعوری طور پر ہندو قومیت کے لیے زمین ہموار کرنے لگا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس سلسلہ کے نامور میں ممتاز رہے، جنھوں نے متحدہ اور وطنی قومیت کے حق میں بھرپور دلائل دیے...... ان کے خیال میں قوم، وطن سے بنتی ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ ارشادِ نبوی کے سراسر خلاف ہے۔

یہ بات نہیں ہے، ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر!'

سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بھی ہوا، لیکن مرحوم نے اس عہدِ سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی، اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علما سیلاب کی زد میں آچکے تھے، صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مولانا نے کہا کہ ہم نے، آپ نے مولانا کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔" [1]

لیکن راقم کے خیال میں آج کا بیدار مورّخ متذکرہ تحریکوں کا تجزیہ درست خطوط پر کر رہا ہے اور پروفیسر مولانا سلیمان اشرف کی خدمات کا اعتراف بھی کر رہا ہے۔ بزرگ نقاد اور تبصرہ نگار محمد احمد سبزواری نے لکھا ہے (کہ جب ۲۱-۱۹۲۰ء میں) خلافت کے خاتمے کا شدید ردِ عمل ظاہر ہوا اور تحریک بحالی خلافت شروع ہوئی، تو کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی، ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا گیا، مسلمانوں نے جائدادیں بیچ کر بیویوں کو طلاق دے کر ہجرت شروع کر دی، یوں لاکھوں مسلمان خاندان تباہ ہو گئے[2]۔ شاہ صاحب (سید سلیمان اشرف) نے اس موقع پر "النور" لکھی۔ اور اس سے پہلے البلاغ۔ کانگریس نے تحریک خلافت کی حمایت کی۔ مسلمان کانگریس کے خفیہ اداروں کو نہ سمجھ سکے اور اس کا شکار ہو گئے۔ شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں ان ہی سازشوں سے متنبہ کیا ہے[3]۔

---

[1] رشید احمد صدیقی، پروفیسر۔ "گنجہائے گرانمایہ"۔ طبع دارالنوادر، لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۲۰-۲۱

[2] "آزادی و حریت کا جذبہ انسانیت کی جان ہے مگر کوئی جذبہ ہو، کوئی قدرت ہو، اگر اعتدال اور سلامت روی کے ساتھ نہیں ہے تو اس کا نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ترکِ موالات کے ہنگامے نے ملک کو جو نقصان پہنچائے، ہزاروں ہندوستانیوں کی آئندہ زندگی کو تباہ کر ڈالا۔ اس کا سبب تھا چادر سے باہر پاؤں پھیلانا، حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا۔ اعتدال پسند، دور اندیش محبانِ وطن وہ مہلک ہنگامہ دیکھتے تھے اور ہاتھ ملتے تھے۔ کچھ کہتے تھے تو بھلا اُن کی کون سنتا تھا"۔ ("آیاتِ وجدانی" از میرزا یگانہ لکھنوی، شیخ مبارک علی اینڈ سنز۔ طبع اوّل ۱۹۲۷ء، ص ۸۱ بحوالہ نجیب جمال، ڈاکٹر: "یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۳۴)

[3] ماہنامہ قومی زبان، کراچی۔ اگست ۲۰۱۲ء، ص ۸۲

معروف اسکالر کیپٹن خالد درانی جو سیاسیات، معاشیات، تاریخ، تاریخ اسلام، اسلامی مطالعہ، فارسی، اردو، بین الاقوامی امور پر ماسٹرز کی ڈگریاں رکھنے کے علاوہ ایل ایل ایم، ایم ایڈ اور ایم بی اے ہیں، پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف کی کتاب النور کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Two Nation Theory and Tehreek-E-Khilafat has been the focus of this book. The learned Professor has had deep insight and has driven home to the reader what miseries the points under debate have brought to the fate of millions of Indian Muslims".

ترجمہ: یہ کتاب دو قومی نظریے اور تحریک خلافت کے گرد گھومتی ہے۔ اس موضوع پر فاضل پروفیسر کی نظر گہری ہے۔ وہ کروڑوں مسلمانوں کی خستہ حالی کا سبب بننے والے امور کی نشان دہی قاری پر بڑے موثر پیرائے میں کرتے ہیں۔

پروفیسر فرخ صابری صاحبہ نے النور کی اشاعت جدید کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف کو سراہا ہے اور لکھا ہے کہ اس کتاب میں "تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات" کے دوران کانگریسی رہنماؤں کے دجل و فریب کا شکار ہو جانے والے رہنماؤں کا ذکر ہے۔ سیّد سلیمان اشرفؒ کے نزدیک یہ مسلم قائدین کوتاہ بینی کا شکار ہو چکے تھے۔ اس تالیف نے اسلامیانِ برصغیر[1] پاک و ہند کی آنکھیں کھول دیں۔ اسے دو قومی نظریے پر ایک مستند دستاویز سمجھا جاتا رہا۔ نیز اس میں دیگر مسائل میں اُس وقت کے اندازِ تعلیم و نصاب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ جو اکبر الٰہ آبادی کہہ گئے تھے۔

....

[1] "لوگ Sub-Continent of Indo-Pakistan کا ترجمہ برصغیر پاک و ہند کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ اس میں "بنگلہ دیش" بھی شامل ہے۔ ثانیاً جب ہم (Continent) کا ترجمہ براعظم کرتے ہیں، تو پھر (Sub-Continent) کا ترجمہ برصغیر کیوں کرتے ہیں۔ اعظم کا اسم تصغیر عظیم ہے صغیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہرۂ آفاق مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تصنیف کا نام "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" رکھا۔ اُس وقت تک بنگلہ دیش کا وجود نہ تھا۔" (محمد اسلم، پروفیسر۔ "تحریک پاکستان" مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲)

پیٹ میں کھانا، زباں پر کچھ مسائل ناتمام
قوم کے معنی گئے اور روح کا مطلب گیا

تو پروفیسر صاحب بھی اُسی دور کی منظر کشی کچھ یوں کرتے ہیں:

''نہ نصابِ تعلیم ایسا رکھا جاتا ہے جس کا پڑھنا اور یاد کرنا سہل ہو، نہ طریقۂ تعلیم میں وہ شان پیدا کی جاتی ہے جس سے طالب العلم میں صحیح استعداد و قابلیت پیدا ہو، نہ نوعیتِ امتحان میں تغیر آتا ہے، نہ پیٹ بھر کھانا نہ راحت رساں لباس۔ اس پر اعلیٰ عہدہ و منصب کا استحقاق ہندوستانیوں کے لیے ممنوع ہے۔'' [1]

فرخ صاحبہ آگے چل کر لکھتی ہیں:

''ہو سکتا ہے آج پون صدی بعد کا قاری مذکورہ بالا مسائل اور مباحث کی نزاکت نہ جانے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''النور'' کی اشاعت جدید اُس دور کی مستند تاریخ ضرور سامنے لاتی ہے جبکہ بہت سے مصائب آج بھی ہماری روح سے چمٹے ہمارے بے حس رویوں پہ گریہ وزاری کرتے ہیں۔ تاریخ کا طالب علم قاری اور محققین حضرات دونوں اس کاوش کو تحسین کی نظر سے دیکھیں گے۔'' [2]

الغرض ان تحاریک کا مطالعہ اگر آپ بالاستیعاب کریں، تو برِ عظیم پاک و ہند میں مولانا سیّد سلیمان اشرف کو آپ جہاں ایک طرف اُن ممتاز علما کی صف میں پائیں گے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے دینی و سیاسی بصیرت سے نوازا تھا، اور جن کا دل ملت بیضا کی فکری بیداری اور ان کے روشن مستقبل کے لیے آشنائے درد تھا...... لیکن کیا یہ پرلے درجے کی بے حسی اور احسان ناشناسی نہیں کہ پون صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود ان کی حیات[3] و کارناموں پر کوئی خاطر خواہ یا مبسوط کام

---

[1] ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور، جلد ۷۵۔ شمارہ مارچ۔ اپریل ۲۰۱۰، ص ۱۰۵ اور ۱۰۶

[2] ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور، جلد ۷۵۔ شمارہ مارچ۔ اپریل ۲۰۱۰، ص ۱۰۶

[3] ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولانا سلیمان اشرف کے احوال و آثار پر یونی ورسٹی کی سطح پر اب تک مختلف مقالات لکھوائے گئے ہوتے اور کتابیں منظر عام پر آ چکی ہوتیں، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ اس کی زیادہ تر ذمہ داری ان

(باقی بر صفحۂ آیندہ)

نہ ہو سکا۔ یہ صفحات اس اغماض کی تلافی تو نہ کر پائیں گے، تاہم اس داستان ناتمام کو (ہم السبیل کے مطالعہ سے پہلے) درج ذیل اقتباس پر ختم کرتے ہیں، جس میں صاحب مضمون ڈاکٹر عبدالباری[1] صاحب نے غالباً مذکورہ امر کی جانب لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا ہے، وہ اپنے ایک مضمون 'مولانا سید سلیمان اشرف' کا آغاز یوں کرتے ہیں:

''سرفروشانِ تحریک علی گڑھ کے سلسلۂ زریں کی داستان بڑی طویل اور تہ دار ہے۔ اسلاف کے کارناموں کی قدرشناسی کا جذبہ قدرے بیدار ہوا اور دیدۂ بینا

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

مذہبی حلقوں پر بھی عاید ہوتی ہے جہاں تحقیق کا فقدان ہے، اور انہیں نت نئے اور پرانے اختلافی مسائل سے ہی فرصت نہیں۔ تاہم یہ بات قدرے اطمینان کا باعث بنی جب اس دوران (مولانا) محمد علی اعظم خاں قادری (ناظم اعلیٰ مدرسہ شرف العلوم غریب نواز، کولکاتہ، بھارت) کی تصنیف حیات وکارنامے سید سلیمان اشرف بہاری (سید صاحب کی حیات مبارکہ پر غالباً یہ پہلی سوانح ہے) دستیاب ہوئی۔ رضوی کتاب گھر دہلی سے ۱۹۹۲ء اور ۲۰۰۸ء میں دوبار چھپی۔ ضخامت ۷۸ صفحات ہے۔ کتاب کے صفحہ ۲۶ سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے اور اس سے پہلے سرزمین بہار شریف میں مدفون چند اہل اللہ کا تذکرہ ہے۔ نیز فاضل مصنف کا اپنا تعارف بھی کوئی ۱۰ صفحات پر محیط ہے۔ سید صاحب کے بارہ بعض نئے گوشے وا ہوئے...... لیکن دوران مطالعہ چند اغلاط بھی سامنے آئیں۔ مثلاً ''مولانا موصوف (سید صاحب) پچاس برس تک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں منصب درس و تدریس پر فائز رہے (ص ۳۶)، جب کہ مذکورہ مدت تیس برس تھی...... علی گڑھ میں سید صاحب سے مولانا مفتی محمد لطف اللہ علی گڑھی کی ۱۹۲۰ء میں کی جانے والی ملاقات کا ذکر کیا گیا (ص ۵۵)، حالانکہ مفتی صاحب کی تاریخ وفات ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء ہے...... سید صاحب کی تاریخ رحلت ۲۶/اپریل ۱۹۳۹ء ہے نہ کہ ۲۷/اپریل (ص ۷۷)...... النور کے بعد آپ نے ارشاد لکھا (ص ۶۶)، ارشاد ۱۹۲۰ء میں لکھا گیا اور النور اس کے ایک سال بعد...... ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں سید صاحب کا تقرر ۱۹۰۲ء میں ہوا (ص ۳۳) درست نہیں، صحیح ۱۹۰۸/۱۹۰۹ء ہے۔ اس بارے میں دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی تحقیق کیے بغیر ۱۹۰۲ء ہی لکھ دیا، جیسے محمود احمد قادری تذکرہ علمائے اہلسنت (کانپور انڈیا ۱۹۷۲ء)، ڈاکٹر حسن رضا صاحب اعظمی نے اپنے ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی کے مقالہ فقیہ اسلام (طبع کراچی ۱۹۸۴ء) اور عبدالشاہد خاں شروانی کی کتاب باغی ہندوستان (طبع پاکستان) کے تتمہ میں مولانا عبدالحکیم شرف قادری نے نقل کیا۔ (ناشر)

[1] ڈاکٹر عبدالباری شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ریڈر ہیں۔ ''ہشام بن عبدالملک۔ حیات و عہد'' پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کئی کتابوں کے مرتب و مصنف ہیں۔ دو درجن سے زائد علمی و تحقیقی مضامین، معتبر جرائد میں شائع ہو چکے یا مذاکروں میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

سے کام لیا جائے، تو ہمیں چمن سرسید کے علمی اُفق پر اِن فدائیان چمن کے بکھرے ہوئے لعل و گہر کے ڈھیر صاف نظر آجائیں۔ ہاں ان میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں، جن کی غیر معمولی دینی غیرت وحمیت اور مومنانہ حق گوئی و بے باکی کے جذبے نے دین وملت کے تئیں اپنی خدمات اور اپنے مقام ومرتبے کو حتی الامکان پردۂ خفا میں ہی رکھنا چاہا۔ یقیناً ایسی ہستیوں کے کارناموں سے روشناسی یک گونہ مزید توجہ کی متقاضی ہوگی۔ مولانا سید سلیمان اشرف بھی انہی چند ہستیوں کی صف میں نظر آتے ہیں، ان کی شخصیت کے رنگ وروپ کی امتیازی شان اور انفرادیت بہت کچھ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے جب ہم اُن کی دینی خدمات کو سامنے رکھتے ہیں اور اُن کی تصنیفی و تالیفی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں، لیکن ایک دوسرے رُخ سے، علمائے ہند کی صف میں مولانا کی نابغۂ روزگار شخصیت ہمیں اور زیادہ قدآور نظر آتی ہے جب ہم ملت بیضا کے تئیں سیاسی اور امور تمدن میں اُن کی بصیرتوں سے بھی قدرے قربت کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی تحریریں، اُن کے بلند سیاسی افکار، اسلامی ثقافت و تمدن کی باریک بینیوں اور قومی وملّی درد کے تب وتاب کا پرتو نظر آتی ہیں"۔ [1]

ظہورالدین خاں امرتسری

ادارہ پاکستان شناسی، لاہور

---

[1] سہ ماہی فکر ونظر، علی گڑھ۔ خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء: نامورانِ علی گڑھ، تیسرا کارواں (جلد دوم)، ص ۴۵، مشمولہ مضمون: 'مولانا سید سلیمان اشرف' از ڈاکٹر عبدالباری

ڈاکٹر عبدالباری صاحب کا یہ مضمون ماہنامہ 'معارف رضا' کراچی کے شمارہ جولائی ۲۰۱۲ء میں شامل کیا گیا ہے، مگر رسالہ کے ادارتی بورڈ کے ایک فاضل رُکن نے روایتی تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، مضمون میں سے 'ناپسندیدہ' مواد یوں نکال پھینکا ہے، جیسے وہ اس تحریر کا حصہ تھا ہی نہیں۔ سرسید احمد خاں مرحوم سے رائے اور موقف کا اختلاف یقیناً ہر کس وناکس کو ہے، مگر اُن کے ذکر سے یوں بدکنا کہ اخلاقی اور صحافتی اصولوں کا خون کر دیا جائے، ہرگز کوئی قابل تحسین اقدام نہیں۔ (ناشر)

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

السبیل: ایک علمی اور تعلیمی دستاویز

عہد اسلامی کے خاتمے اور زوال کے باوجود برعظیم کے مسلمانوں میں ان کی روایتی تعلیم اور اسلامی علوم کا تسلسل انگریزوں کے اقتدار اور مغربی تعلیم و تہذیب کے فروغ کے باوجود ٹوٹنے نہیں پایا۔ انگریزوں کے اقتدار کے آغاز تک تعلیم نے مسلمان حکمرانوں اور امراء کی سرپرستی کے طفیل اس حد تک ترقی حاصل کر لی تھی کہ چھوٹے چھوٹے قصبات تک بڑے بڑے علماء پیدا کرنے لگے تھے [1]۔ عہد مغلیہ کے دورِ زوال میں بھی متعدد اہم مدرسوں کے قیام کا سلسلہ جاری رہا۔ لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسہ اور دہلی میں شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۴ء) کے والد شاہ عبدالرحیم (۱۶۴۴ء۔۱۷۱۸ء) کا "مدرسۂ رحیمیہ" اسی عہد میں قائم ہوئے۔ اس عہد میں اورنگ زیب (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) کی قائم کی ہوئی روایت کے باعث مذہبی تعلیم کو، جو اکبر (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کی مخصوص حکمت عملی کی وجہ سے قدرے غیر مذہبی یا سیکولر (Secular) ہو گئی تھی، دوبارہ فروغ حاصل ہوا۔ اورنگ زیب کی دل چسپی کے نتیجے میں دینیات کے ان طلبہ کو، جو ایک خاص سطح تک تعلیم حاصل کر لیتے تھے، بالخصوص وظائف دیے جانے لگے۔ ایسے اقدامات بھی شروع کیے گئے، جن کا مقصد دینیات کی تعلیم کو بالخصوص ان طبقات تک وسعت دینا تھا، جو ہندوؤں کے زیر اثر تھے [2]۔ مسلمانوں کی تعلیمی رواداری میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ ہندوؤں کا ہر طبقہ اور ان کی ہر ذات تعلیم کی برکتوں سے بدستور فیض پاتی رہی۔ یہاں تک کہ برہمنوں سے زیادہ کائستھ اور کھتری تعلیم یافتہ ہو گئے [3]۔ اب کسی مدرسہ میں فارسی کا ہندو استاد ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں رہی تھی [4]۔

انگریزی عہد میں بنگال اور پنجاب کے بعض اضلاع میں، جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی، دیکھا

گیا کہ فارسی مدرسوں میں اکثریت ہندو طلبہ کی ہوتی تھی [5]۔ ہندو تعلیم حاصل کر کے مسلمانوں کی عالمانہ تحقیقات سے آشنا ہوئے اور اس سے انھیں جو مجموعی فوائد حاصل ہوئے، وہ بعد میں خود ان کی ہندو قومیت کی تشکیل اور ان کے قومی و سیاسی شعور کی بیداری کا باعث بنے۔ اسی شعور کا ثمر تھا کہ جب عیسائی مشنریوں نے انگریزی اسکول قائم کیے، تو ہندوؤں نے بہت جلد ان سے فیض اٹھانا شروع کر دیا [6]۔

مسلمانوں کے عہد، بالخصوص عہد مغلیہ میں علم و تعلیم کی اشاعت اس قدر وسیع پیمانہ پر ہو چکی تھی کہ مغلیہ حکومت کے طویل عہد زوال میں سیاسی انحطاط کے باوجود تعلیمی درس گاہیں اور مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت نہ صرف بدستور رہا بلکہ ان میں کہیں کہیں مزید ترقی ہوئی۔ مولانا عبدالرحیم، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم (۱۷۳۱ء۔۱۸۲۰ء)، شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء۔۱۸۲۳ء) اور شاہ غلام علی دہلوی (۱۷۷۳ء۔۱۸۲۴ء) مسلمانوں کے اسی دورِ انحطاط میں اشاعت تعلیم اور اپنے درس و تدریس کی وجہ سے خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے۔ سیاسی طور پر تو مرکز برابر کمزور ہوتا رہا، لیکن جو نئی مسلمان سلطنتیں اور ریاستیں وجود میں آئیں، ان کے اکثر حکمرانوں نے علم کی سرپرستی کی۔ بعض علماء نے بھی انتہائی ایثار سے اپنی زندگیاں درس و تدریس کے لیے وقف کر دیں اور یہی وجہ ہے کہ سیاسی انحطاط کے باوجود علمی انحطاط کی رفتار نسبتاً کم رہی [7]۔ اور بعض مسلم ریاستوں، مثلاً اودھ، روہیلکھنڈ اور حیدر آباد میں تعلیمی معیار برقرار رہا اور چند نئے تعلیمی مراکز، مثلاً بلگرام، الہ آباد اور سہالی وجود میں آئے اور دہلی کی حکومت ختم ہونے کے باوجود خود دہلی اور اس کے اضلاع میں تعلیمی ترقی کی روایت برقرار رہی [8] اور معاشی زبوں حالی کے باوجود اس دور میں ایسے مدرس بکثرت تھے، جو عمر بھر طلبہ کو درس دینے کے ساتھ ساتھ اپنی قلیل آمدنی سے جو کچھ پس انداز کرتے، اسے کسی مدرسے کی تعمیر میں ہی صرف کر دیتے [9]۔ یہ علماء ہی تھے کہ سیاسی زوال کے عرصے میں حکومت اور امراء کی سرپرستی اور مالی امداد سے قطع نظر ملک کے روایتی تعلیمی نظام کو قائم رکھنے اور وسعت دینے میں مشغول رہے۔

اسی طرح انگریزوں کی آمد کے وقت مسلمانوں میں تعلیم کا اپنا ایک خاصہ جمہوری نظام

روبہ عمل تھا، جس میں تعلیم اور مذہب کے درمیان رابطہ کو استوار رکھا گیا تھا اور عربی زبان اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ تھی۔ ہر سطح کی تعلیم، ایک سرمایہ تھی، جسے ہر کوئی بلا روک ٹوک حاصل کر سکتا تھا۔ نہ اس پر کوئی شرط اور پابندی عائد ہوتی اور نہ اسے کسی طرح کا معاوضہ ادا کرنا ہوتا۔ سیاسی صورت حال کے بدل جانے کے باوجود تعلیم کا یہ نظام اس وقت تک برقرار رہا، جب تک کہ انگریزوں نے سیاسی اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد تعلیمی نظام میں تبدیلی کی صورت نہ پیدا کر دی۔ لیکن انگریزوں کی آمد اور سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کے کچھ عرصے بعد تک بھی یہ صورت حال کم وبیش اسی طرح برقرار رہی کہ محض بنگال میں، جہاں انگریزوں نے سب سے پہلے قدم جمائے، اسّی ہزار مدرسے تھے اور وہاں چار سو کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا[10] اور قصبات کے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے تھے[11] اور اس وقت تک جب تک کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے دیہی اداروں کو توڑا نہیں، دیہاتوں میں قدیم تعلیمی ادارے بدستور برقرار رہے، لیکن سرپرستی سے بتدریج محروم ہوتے گئے۔

علماء کو، جو بنیادی طور پر تعلیم وتدریس کے مشغلہ سے منسلک ہوتے تھے، قدیم معاشرہ میں جو حیثیت اور مقام حاصل تھا، قدروں کی تبدیلی کے باوجود، بڑی حد تک برقرار رہا۔ لیکن اس قسم کی تبدیلیوں کا اثر یہ ہوا کہ علماء کا رابطہ اپنے معاشرہ سے نسبتاً کم ہو کر رہ گیا۔ اس طرح انگریزی اقتدار میں رائج انگریزی تعلیم کا بڑھتا ہوا سیلاب ہی تھا کہ جس نے معاشرہ میں انھیں ہر طرح متاثر کیا۔ چناں چہ ان نئے حالات اور اثرات میں انھوں نے ملی جذبہ کے تحت اپنی زندگیاں اس مذہبی تعلیم کے لیے وقف کر دیں، جس پر اب خود ان کی اور ان کی قوم کی زندگی اور ان کے دین وایمان کا دارومدار رہ گیا تھا۔ لہٰذا بڑی مستقل مزاجی، مستعدی اور خلوص وبے لوثی کے ساتھ وہ اپنی تعلیم وتدریس کی روایات برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے اور ملک اور معاشرہ میں ہر طرح کے زوال کے باوجود علم اور تعلیم ان کی زندگی کا لائحۂ عمل بنے رہے۔ لکھنؤ کا مدرسہ فرنگی محل، اور دہلی کا "مدرسہ رحیمیہ" مسلمانوں کے عہد زوال کی سب سے بڑی علمی یادگاریں ہیں۔ فرنگی محل نے علوم اسلامی کے فروغ اور اس کی روایات کو آگے بڑھانے میں قابل قدر حصہ لیا، اور اس سے منسلک اور مستفیض علماء نے برعظیم کی قومی اور سیاسی تحریکوں کے دوران مسلمانوں کی رہبری اور

قیادت کی۔ 'مدرسہ رحیمیہ' کے فیض سے شاہ ولی اللہ اوران کے فرزندوں کی تحریک نے آیندہ ڈیڑھ سو برسوں تک برعظیم کے مسلمانوں پر اپنا راست اثر قائم رکھا، جس سے بیسویں صدی کے وسط تک پیدا ہونے والی تمام اسلامی تحریکیں متاثر ہوئیں۔ 'شاید ہی کوئی قابل ذکر عالم، جو چاہے بعد میں دار العلوم دیوبند یا مولانا احمد رضا خان بریلوی (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) اکے فیض یافتگان میں اس عرصہ میں ایسا ہو، جس کا سلسلہ علمائے فرنگی محل اور شاہ ولی اللہ کے فرزندوں یا شاگردوں میں سے کسی تک نہ پہنچتا ہو'[۱۲]۔

دیوبند کا مدرسہ، علی گڑھ میں سید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کے قائم کردہ 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' سے، جو سید احمد خاں کی ہمہ گیر تعلیمی تحریک کا ایک اہم اقدام تھا، چند سال قبل قائم ہوا تھا۔ یہ دونوں ادارے، جن کے درمیان کچھ عرصہ بعد اولاً قدرے کشیدگی لیکن پھر مخصوص باہمی روابط کی صورتیں پیدا ہوئیں، دراصل ایک ہی مسلک روحانی کے تحت قائم ہوئے تھے، جس کا سلسلہ شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے[۱۳]۔ لیکن دیوبند سے قطع نظر، کہ جس نے نصاب اور نظام تعلیم میں روایت اور مراجعت کو مدنظر رکھا[۱۴]، سید احمد خاں نے قدیم اور جدید علوم کا ایک متوازن نصاب علی گڑھ کالج کے لیئے تجویز کیا تھا۔ ویسے مولانا قاسم نانوتوی (متوفی ۱۸۸۰ء) بھی مدرسہ کے نصاب میں قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے حق میں تھے[۱۵] اور اس مقصد سے کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ دوسرے اداروں میں جا کر انگریزی اور جدید علوم حاصل کرنا چاہیں تو جاسکیں، دس سالہ نصاب کو کم کر کے چھے سالہ کر دیا گیا، تاکہ طالب علم کم عمری ہی میں دوسرے ادارے میں داخل ہو سکے[۱۶]۔

سید احمد خاں کے علاوہ، کہ جو دیوبند اور اس کے مقصد کو سراہتے تھے[۱۷]، نواب وقار الملک (۱۸۴۷ء۔۱۹۱۷ء) نے دیوبند کے لیے حکومت حیدر آباد سے مالی امداد کا انتظام کرایا، اور ایک موقع پر دیوبند کے طلبہ نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا[۱۸]۔ اس کے جلسوں میں علی گڑھ تحریک کے ایک فعال رکن صاحب زادہ آفتاب احمد خاں (۱۸۶۷ء۔۱۹۳۰ء) بھی شریک ہوتے تھے۔ اس وقت دیوبند کی علی گڑھ کالج سے یہ مفاہمت ہوئی تھی کہ دیوبند کے مذہبی تعلیم یافتہ

اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو علی گڑھ میں حاصل کریں اور علی گڑھ کے انگریزی خواندہ وہ طلبہ، جو مذہبی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو دیوبند سے رجوع کریں [19]۔ یہ صورت دراصل اس بات کی علامت تھی کہ دونوں مکاتبِ فکر کے نقطۂ نظر بنیادی طور پر وقتی ضرورتوں کے تحت ایک درمیانی راہ کی تلاش میں تھے اور سید احمد خان روایتی تعلیم سے دور نہ ہونا چاہتے تھے اور مشرقی علوم کے ادارے جدید علوم کی اہمیت سے بے نیاز نہ تھے۔

سید احمد خاں نے بنیادی طور پر دراصل یہی کوشش کی تھی کہ مسلمان عصری تقاضوں کے تحت مغربی تعلیم حاصل کریں اور انگریزی زبان سیکھیں۔ وہ انھیں مسلمانوں کے تمام امراض کا شافی علاج سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود مذہبی علوم اور عربی و فارسی سے انھوں نے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ اپنے تعلیمی منصوبوں کی مخالفت کے نتیجہ میں انھوں نے ''مدرسۃ الاسلام'' کے لیے، جو بعد میں ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' بن گیا، ۱۸۷۴ء میں مذہبی علوم کے نصاب کی تیاری کے لیے ایک مجلس تشکیل دی، جس میں اس وقت کے جید علماء شامل تھے، لیکن علماء کے رویہ کی وجہ سے انھیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ علماء نے انکار کر دیا کہ وہ کسی ایسی مجلس میں کام نہیں کر سکتے، جس میں شیعہ بھی موجود ہوں [20]۔

اس کے باوجود کہ سید احمد خان جدید تعلیم کے حق میں ہو گئے تھے، اپنی ساری تعلیمی تحریک میں انھوں نے علوم شرقیہ کی تعلیم سے چشم پوشی نہیں کی۔ وہ تو چاہتے تھے کہ مذہبی علوم اور عربی، جو مسلمانوں کی ملی نشانیاں اور روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں، بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا سرمایہ ان کی ترویج اور ترقی پر صرف کیا جائے [21]۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں کی تعلیم کی سرپرستی نہیں کر سکتی اور کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ ذلت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو نظر انداز کر دے [22]۔ انھوں نے ''اینگلو-اورینٹل'' کالج قائم کیا تھا، جس میں مشرقی اور مغربی علوم کے علاحدہ علاحدہ شعبے تھے۔ مشرقی علوم کے شعبہ میں اردو میں علوم شرقیہ، فارسی و عربی ادب اور جدید علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اس میں انگریزی بھی بطور زبان پڑھائی جاتی تھی۔ مغربی علوم کے شعبہ میں

یونیورسٹی کا مقررہ نصاب پڑھایا جاتا تھا[۲۳]۔ کچھ عرصہ تک یہ دونوں شعبے جاری رہے، لیکن علوم شرقیہ کا شعبہ زوال پذیر رہا۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی تعداد طلبہ کی تعداد سے زیادہ ہوگئی، چناں چہ مجبوراً اسے بند کر دیا گیا[۲۴]۔

سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک نے برعظیم کے مسلمانوں کی فکری، سیاسی اور معاشی زندگی میں انقلابی اور دور رس تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ ان کا اصرار انگریزی ذریعۂ تعلیم اور جدید علوم پر رہا، لیکن انھوں نے مذہب، علوم شرقیہ اور عربی و فارسی کو کبھی غیر ضروری اور غیر اہم نہیں سمجھا۔ ان کے بعد ان کے رفقاء کے نقطۂ نظر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تمام سرگرمیوں میں بھی یہ طرز فکر برقرار رہا۔ عربی، علوم شرقیہ اور مذہب کی تعلیم پر زور بتدریج بڑھتا ہی رہا، کیوں کہ انھیں برعظیم میں مسلمانوں کی تہذیب کے نمایاں وصف کی حیثیت حاصل تھی[۲۵]۔ سید احمد خاں نے اپنی تعلیمی تحریک کا اصل بنیادی پتھر علی گڑھ کالج کی صورت میں نصب کیا تھا، جو ایک تعلیمی ادارہ سے بڑھ کر مسلمانوں کا تہذیبی، ادبی اور سیاسی مرکز بن گیا اور اس نے قوم کو ایسے رہنما عطا کیے، جنھوں نے اسلام اور مسلم ملت سے اپنی بنیادی وفاداری ترک کیے بغیر قوم کو بیداری اور ترقی سے ہم کنار کیا اور اسے قیام پاکستان کی منزل تک پہنچایا[۲۶]۔

اس طرح برعظیم میں مسلمانوں کی تعلیم، قدیم و جدید تعلیمی اداروں یا ان سے ملحقہ اور ان کے زیر اثر قائم ہونے والے اداروں کے طفیل، دو راستوں سے آگے بڑھی ہے۔ یہ راستے ایک دوسرے سے بہت دور کبھی نہیں رہے، بلکہ آپس میں خلط ملط ہوتے رہے ہیں۔ یہ اختلاط اس وجہ سے ہوا ہے کہ قدیم تعلیم عصری تقاضوں اور ناگزیر صورت حال میں جدید تعلیم سے اتصال پر مجبور ہوتی رہی۔ تعلیم کے جدید یا قدیم ہونے کے ان تنازعات سے قطع نظر اور اس سے بھی قطع نظر کہ مسلمانوں نے کس قسم کی تعلیم حاصل کی، ان میں تعلیم کو عام کرنے اور ہر سطح کی تعلیم کا ان میں شوق پیدا کرنے کی کوششوں کا نتیجہ قدرے امید افزا نکلا۔ برعظیم کے بیشتر علاقوں کے مسلمانوں میں تعلیم سے رغبت پیدا ہوئی اور وہ اس کے حصول کے لیے کوشاں ہوئے۔ چناں چہ ان کی تعلیم کی جو شرح انیسویں صدی کے اواخر میں تھی، بیسویں صدی کے نصف اول میں بڑھ کر کہیں سے کہیں

پہنچ گئی [27] لیکن یہ شرح ابتدائی تعلیم میں اوران کے اپنے نجی مکتبوں اور مدرسوں کی وجہ سے تھی [28] جن میں وہ علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرتے۔

بعد کی سیاسی صورتِ حال میں کہ جس میں ہندو اپنی قومیت کے جذبے سے سرشار صرف اپنی قوم کی بھلائی اور بہتری کے اقدامات پر کمر بستہ تھے اور جب ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں کامیابی کے نتیجے میں انھوں نے اپنی حکومتیں بنا کر اپنا تعلیمی نظام رائج کرنا چاہا تو وہ قومی اور مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہ تھا۔ اس متعصبانہ نظام تعلیم میں مسلمانوں کے لیے علحدہ مسلم اسکولوں اور مسلمان اساتذہ کی تربیت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ بل کہ سفارش کی گئی کہ تمام اسلامی مدارس اور مسلم اسکول 'ودیا مندر' میں تبدیل کر دیے جائیں، تا کہ تمام تعلیمی اداروں میں یکساں نصاب کے ذریعہ یکساں معیار قائم کیا جاسکے [29]۔

یہ اقدامات اور صورت حال، مسلمانوں کی شکایات کو، جن کا رخ اب حکومت سے بڑھ کر [30] ہندوؤں کی طرف بھی ہو گیا تھا، جائز اور فطری ٹھہراتی ہیں۔ مسلم لیگ نے انڈین نیشنل کانگریس کی قائم کردہ حکومتوں کے ماتحت مسلمانوں پر ہونے والی زیادتیوں پر تیار کی جانے والی اپنی روداد میں ان مشاہدات اور شکایات کو مرتب کیا، جو کانگریس حکومتوں کے بارے میں مسلمانوں میں عام تھیں۔ ان شکایات میں تعلیم بھی شامل تھی اور اس میں بالخصوص 'واردھا' اور 'ودیا مندر' کے حوالہ سے مسلمانوں میں پائے جانے والی بے چینی کا جائزہ لیا گیا تھا [31]۔ ۱۹۳۹ء میں 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' نے بھی اپنے ۵۲ ویں اجلاس، منعقدہ کلکتہ میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لیے ممتاز ماہرین تعلیم کی مجلس کا تقرر کیا، تا کہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے پیش نظر ان کی تعلیم کا ایک منصوبہ اس نقطۂ نظر سے تیار کرے کہ اس سے ان کی معاشرت اور ثقافت کے امتیازی اوصاف کی حفاظت ہو سکے۔ نواب کمال یار جنگ (۱۸۹۴ء۔۱۹۴۴ء) اس کے سربراہ تھے۔ اس مجلس کا اصل کام ایک ذیلی مجلس نے مسلم لیگ کے رکن عزیز الحق (۱۸۹۸ء۔۱۹۴۷ء) کی نگرانی میں مکمل کیا۔ مجلس نے اپنی روداد ۱۹۴۲ء میں شائع کی [32]۔

مسلمانوں کے پیش نظر نئے حالات میں اپنی قوم کے لیے مناسب تعلیم کا خاکہ ہمیشہ

ہی اہم رہا اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق انھوں نے ہر دور میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں نصاب میں ضرور کرنا چاہیں۔ کانگریس کے تعلیمی منصوبہ کے ردعمل میں انھوں نے اپنی قوم کے لیے مناسب نظام تعلیم کی بابت بھی سوچا۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۵ء) نے، جو لیگ کی مذکورہ روداد مرتب کرنے والی ایک ذیلی مجلس میں شامل تھے[۳۳] اور جنھوں نے ڈاکٹر ظفر الحسن (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۹ء) کے ساتھ مل کر تقسیم ہند کا ایک منصوبہ، جسے عرف عام میں 'علی گڑھ منصوبہ' سے موسوم کیا گیا ہے، پیش کیا تھا[۳۴] لیگ کی خواہش پر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک خاکہ تیار کرنے کی خاطر ایک تعلیمی مجلس کے داعی کی حیثیت سے ممتاز ماہر تعلیم کے مشورہ سے ایک منصوبہ تیار کر کے ۱۹۴۰ء میں پیش کیا[۳۵]۔ ڈاکٹر ظفر الحسن کے ایک شاگرد، محمد فضل الرحمٰن انصاری (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۴ء) نے بھی مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا ایک خاکہ مرتب کیا[۳۶]۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی (۱۸۸۶ء۔۱۹۶۲ء) کی تصنیف: Al-Minhaj, being the Evolution of Curriculum in the Muslim Educational Institutions of India.[۳۷] میں بھی اس مسئلہ پر چند اہم تجاویز شامل ہیں، لیکن اس موضوع پر ایک بہت مفصل منصوبہ A Plan of Muslim Educational Reform لیگ کی تعلیمی مجلس اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مرکزی مجلس قائمہ کے ایک رکن، الیف۔ کے خان درانی (متوفی ۱۹۴۶ء) نے پیش کیا[۳۸]۔ یہ بعض اعتبار سے دیگر منصوبوں سے زیادہ مفصل تھا کہ اس میں مسلمانوں کی تعلیم کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کو شامل کیا گیا تھا اور اس میں قومی ضرورتوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بعض علماء نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا اور مفید منصوبے مسلمانوں کی مذہبی و قومی تعلیم کے بارے میں پیش کیے۔ خصوصاً سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۳ء) اور سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء) کے نام یہاں لیے جا سکتے ہیں۔ سلیمان ندوی نے اپنے خیالات 'اردو اکادمی'، جامعہ ملیہ اسلامیہ' دہلی کے ایک جلسہ منعقدہ اپریل ۱۹۳۲ء کے اپنے خطبہ میں[۳۹] اور سید مودودی نے 'ندوۃ العلماء' کے ایک جلسہ منعقدہ جنوری ۱۹۴۱ء کے خطبہ میں[۴۰] پیش کیے۔ ان خطبات کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم کی نسبت سے مقتدر علماء کے نقطۂ

نظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ خطبات کانگریس کے مذکورہ منصوبہ کے راست ردعمل میں نہیں بل کہ ان علما کی اپنی فکری تحریک کا ایک حصہ تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں قیام پاکستان کے بعد ایک نئی آزاد مسلم مملکت کے لیے قوم کی ضرورتوں کے مطابق ایک مناسب تعلیمی نظام وضع کرنے کے لیے جاری رہا۔ اس ضمن میں شجاع احمد ناموس (متوفی ۱۹۸۴ء) نے ایک بہت مفصل منصوبہ ''آزاد قوم کا نظام تعلیم اور پاکستان'' ذاتی سطح پر پیش کیا [۴۱]، جسے ایک مخلصانہ کاوش کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسی کاوشیں بعد میں ایک بڑی تعداد میں منظر عام پر آتی رہیں۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی قومی تعلیم کی یہ صورت حال دراصل ان کے تعلیمی عروج و زوال کی روداد بھی ہے۔ اس صورت حال میں وہ انفرادی یا جامعاتی صورتِ حال اور وہ کوششیں بھی شامل ہیں جو اس خطے میں مسلمانوں کے لیے ان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے مطابق ان کے لیے قومی سطح پر ایک مناسب نصاب کی تشکیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اوپر جن کوششوں کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ تو نوآبادیاتی عہد کے دورِ آخر میں پیش آمدہ ضرورتوں کے تناظر میں سامنے آئیں، لیکن ان کا سلسلہ عہد مغلیہ کے دورِ زوال میں ''درس نظامی'' کی ترتیب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر بعد کی ضرورتوں میں یہ عمل مزید بڑھا ہے۔ چناں چہ جب سید احمد خان نے قوم میں جدید تعلیم کو رائج کرنا چاہا تو قدیم اور روایتی نصاب کو نظر انداز نہ کیا۔ اگر چہ ان کا اصرار انگریزی ذریعۂ تعلیم اور جدید علوم پر رہا، لیکن انھوں نے مذہب، علوم شرقیہ اور عربی و فارسی کو کبھی غیر ضروری اور غیر اہم نہیں سمجھا۔ ان کے بعد ان کے رفقاء کے نقطۂ نظر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تمام سرگرمیوں میں بھی یہ طرز فکر برقرار رہا۔ عربی، علوم شرقیہ اور مذہب کی تعلیم پر زور بتدریج بڑھتا ہی رہا، کیوں کہ انھیں برعظیم میں مسلمانوں کی تہذیب کے نمایاں وصف کی حیثیت حاصل تھی [۴۲]

اس کے باوجود کہ علیگڑھ یونی ورسٹی میں قدیم و جدید نظام تعلیم اور نصاب ساتھ ساتھ جاری رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، قومی احساسات کے فروغ کے سبب یہ حکمت عملی ہر ایک کے لیے تسلی بخش اور قابل اطمینان بھی نہ رہی، اس لیے اس میں مزید بہتری کی بابت سوچا جاتا رہا۔ اس خیال کو اس وقت مہمیز ملی جب کلکتہ یونی ورسٹی میں مطالعاتِ اسلامی کے آغاز اور

اسے کلیۂ فنون کا حصہ قرار دیا گیا۔ یہی وقت تھا کہ مملکتِ حیدرآباد میں عثمانیہ یونی ورسٹی قائم ہوئی تھی اور اس میں ایک بہت مناسب نصاب مطالعات اسلامی کا نافذ کیا گیا۔ ان دونوں یونی ورسٹیوں میں مطالعاتِ اسلامی کو جو اور جیسی اہمیت دی گئی اس میں فرق تھا۔ یہ مسائل مسلم یونی ورسٹی میں اس وقت زیر بحث آئے جب صاحبزادہ آفتاب احمد خان (۱۸۶۷ء۔۱۹۳۰ء) نے بحیثیت وائس چانسلر اختیارات سنبھالے اور اس جانب بھی خاص توجہ کی اور انھوں نے یونی ورسٹی کے اکابر اور علماٗ کو ایک خط لکھ کر اس ضمن غور وفکر کی دعوت دی۔ اس بحث میں مولانا سید سلیمان اشرف (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۹ء) نے بھی اپنے جذبۂ ایمانی وعلمی کے تحت حصہ لیا اور وائس چانسلر کو اس خط کے جواب میں خود ایک تائیدی خط تحریر کر کے مطالعہ اسلامی کے نصاب میں اہم تبدیلیوں کی بابت اپنی رائے پیش کی تا کہ مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے حقیقی مقاصد کی طرف بڑھا جاسکے۔ ان کے اس خط کی بنیاد پر وائس چانسلر نے خود انھیں ایک مفصل رپورٹ اس بابت لکھنے کی دعوت دی، جو انھوں نے بخوشی منظور کر لی اور اپنی تجاویز پر مبنی ایک جامع رپورٹ تحریر کی۔ ان کی وہ رپورٹ اکیڈمک کونسل میں پیش کی گئی جو منظور کر لی گئی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے اپنا وہ خط یونی ورسٹی کے باہر کے ماہرین اور علما و مفکرین کو بھی ارسال کیا تھا۔ اس وقت کے نمایاں مفکرین میں علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کو بھی یہ خط موصول ہوا تو انھوں نے اس خط کے جواب صاحب زادہ صاحب کے عزائم و مقاصد کو سراہتے ہوئے نہایت تفصیل سے اپنے عالمانہ خیالات اس باب میں بیان کیے جو مطالعاتِ اسلامی کے ضمن میں اقبال کے نقطۂ نظر اور خیالات و افکار کی بہت عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔[۴۳]

صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے دور میں ان کی کوششوں کے سبب مسلم یونی ورسٹی میں مطالعاتِ اسلامی کی تاریخ کا یہ اہم واقعہ یا اقدام تھا کہ اس کی تعلیم کے لیے ایک بہت جامع منصوبہ اور اس کے مطابق ایک بہترین ممکنہ نصاب بھی تجویز اور منظور ہو گیا۔ مولانا سید سلیمان اشرف کی وہ مکمل رپورٹ، اپنے پس منظر اور اپنے کُل عناصر و مشمولات کے ساتھ زیر نظر کتاب میں شامل ہے، جس کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ محل نہیں، اندرونی صفحات پر سب دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس رپورٹ

پر یونی ورسٹی کے اکابر: محمد مزمل اللہ خان (۱۸۶۵ء۔۱۹۳۸ء)، قائم مقام وائس چانسلر؛ ضیاء الدین احمد (۱۸۷۸ء۔۱۹۴۷ء)، پرو وائس چانسلر؛ نواب حبیب الرحمن خان، صدر یار جنگ (۱۸۶۶ء۔۱۹۵۰ء)، رکن، کونسل و کورٹ؛ قاضی سید فخر الدین (۱۸۶۶ء۔۱۹۳۳ء)، رکن، مجلس تاسیس نے جو اپنی آرا تحریر کی تھیں، وہ بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ اس رپورٹ کو اس کے مندرجات و مباحث کی اہمیت کے پیش نظر استفادۂ عام کے لیے یونی ورسٹی نے ۱۹۲۴ء میں شائع کر دیا، لیکن اپنی اشاعت کے بعد سے، اپنی اہمیت کے باوجود، یہ دوبارہ کبھی شائع نہیں ہوئی اس لیے قریب قریب نایاب تھی اور فراموش بھی ہو چکی تھی۔

اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر کہ یہ اس خطے میں ہماری تعلیمی زندگی اور خاص طور پر مطالعاتِ اسلامی کے نشیب و فراز کو، نہ صرف ہمارے ماضی کی کاوشوں اور جدوجہد اور عزائم و مقاصد کے ساتھ، ہمارے سامنے لاتی ہے بلکہ اگلے کسی سہانے وقت میں کسی جامعہ یا علمی ادارے کو اسلامی تعلیمات یا مطالعاتِ اسلامی کے فروغ و نفاذ کا جذبہ تحریک دے تو یہ اس کے کام آسکے۔ یہ تصنیف اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں جامعات کے لیے بلکہ اعلیٰ دینی مدارس کے لیے نہ صرف ان کی دینی و علمی ضرورتوں اور تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ایک مکمل اور معیاری نصاب کے لیے تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں جن کے مطابق ایک عمدہ اور مفید نصاب تیار کیا جا سکتا ہے۔

''ادارۂ پاکستان شناسی'' کے روحِ رواں جناب ظہور الدین خان صاحب نے، جو اپنے علمی ذوق اور تحرک کی ایک نمائندہ مثال ہیں، مولانا سید سلیمان اشرف کی علمی خدمات کے بے حد معترف اور مداح ہیں۔ قبل ازیں انھوں نے ان کی تصانیف میں سے ''النور'' اور ''البلاغ'' آج کے قارئین کے لیے نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کیں، زیر نظر کتاب کو بھی اپنے سلسلۂ اشاعت میں شامل کرنا پسند کیا، جو قومی تعلیم اور مطالعاتِ اسلامی سے ان کے مثالی شغف کا عین ثبوت ہے۔ اس زیر نظر کتاب کی اشاعت بھی ان کا اور ان کے ادارے کا ایک مزید مخلصانہ اور مؤثر اقدام ہے، جو یادگار رہے گا۔

اسناد و حواشی

۱۔ قریشی، اشتیاق حسین، ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۷: ''اس وقت قصبات کا نظام ممالک اسلامیہ میں قائم تھا۔ یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے، جن سے شہر خصوصاً دارالسلطنت سیراب وشاداب رہتے۔ شہری آب و ہوا دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو ست اور پست کر دیتی تو قصباتی اہل کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے اور بزم حیات کو از سر نو پرنور و معمور فرما دیتے۔ دہلی مرحوم میں شاہ صاحب کا اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں۔'' شروانی، حبیب الرحمن خاں ''استاذ العلماء (حیات مفتی لطف اللہ علی گڑھی)''، علی گڑھ، ۱۹۳۲ء، ص ۱

۲۔ مثلاً بوہرے۔ لاء، این۔ این، Promotion of Learning in India during Mohammadan Rule. لندن، ۱۹۱۶ء، ص ۱۱۷

۳۔ ندوی، سید سلیمان، ''حیات شبلی''، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۲۹

۴۔ ان میں ایک بڑی تعداد میں فارسی پر عبور رکھنے والوں کے نام ملتے ہیں، تفصیلات کے لیے: ایضاً، ص ۳۲۔ ۴۲ و بعدہٗ؛ ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ''، دہلی، ۱۹۴۲ء، اس موضوع پر جامع ہے۔

۵۔ شارپ، ایچ (Sharp, H.)، Selections from Educational Records.، کلکتہ، ۱۹۲۰ء، ص ۲۹۰

۶۔ اور انگریزی عہد میں ان کا انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق اس حد تک روز افزوں رہا کہ جب ۱۸۳۰ء میں ایک عیسائی مشنری الیگزنڈر ڈف (A. Duff) (۱۸۰۶ء۔ ۱۸۷۸ء) نے کلکتہ میں ایک مشنری انگریزی اسکول قائم کیا، تو اسے گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ پر داخلہ کی کچھ پابندیاں عائد کرنی پڑیں؛ مہر علی، محمد، The Bengali Reaction to Christian Missionary Activities.، چٹاگانگ، ۱۹۶۵ء، ص ۶۹

۷۔ معین الحق، ''معاشرتی و علمی تاریخ''، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۴۶۳؛ اس صورت حال کو سید سلیمان ندوی کی تصنیف ''حیات شبلی'' کے مقدمہ میں تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے، ص ۱۔ ۵۷

۸ اضلاع روہیلکھنڈ میں تقریباً پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس وتدریس میں مصروف رہتے تھے اور حافظ رحمت خاں (۱۷۰۸ء۔۱۷۷۴ء) کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔ بریلوی، الطاف علی، سید، "حیات حافظ رحمت خان"، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۱

۹ فرخ آبادی، ولی اللہ، مفتی، "عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ"، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۳۲

۱۰ لیکن ولیم آدم (W. Adam) کے ابتدائی جائزہ کے مطابق بنگال اور بہار میں ایک لاکھ مدرسے موجود تھے۔ دور دراز اور دشوار گزار مقامات پر دو ہزار کی آبادی پر ایک مدرسہ کا تناسب تھا۔ ہارٹوگ، پی۔ (Hartog, P)، SOme Aspects of Indian Education, Past and Present. لندن، ۱۹۳۹ء، ص ۱۳، ۷۵ وبعدہٗ۔

۱۱ جب کہ اس وقت قائم ہونے والے انگریزی اسکولوں میں صرف پڑھنا سکھایا جاتا تھا اور کبھی کبھی صرف ایک مضمون پڑھایا جاتا تھا۔ لائرڈ، ایم اے (Laird, M.A.)، Missionaries and Education in Bengal. آکسفورڈ، ۱۹۷۲ء، ص ۴۴

۱۲ اکرام، شیخ محمد، "رودِ کوثر"، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۶۰۵

۱۳ سندھی، عبید اللہ، "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۸؛ سید احمد خاں کی شاہ ولی اللہ کی فکر اور تحریک سے نسبت کے لیے: شاہجہانپوری، ابوسلمان، "شاہ ولی اللہ اور سرسید"، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء؛ و نیز مٹکاف، باربرا (Metcalf, Barbara)، Islamic Revival in British India, 1860-1900. پرنسٹن، ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۔۷۴ وبعدہٗ؛ اکرام، شیخ محمد، "موجِ کوثر"، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۹۳۔۱۹۵

۱۴ یہاں تک کہ مولانا گنگوہی قرونِ وسطیٰ کے عقلی علوم کو بھی نصاب میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ص ۲۷؛ چناں چہ اپنے زمانہ میں انھوں نے مدرسہ کے نصاب سے معقولات کو خارج کر دیا۔ گیلانی، مناظر احسن، "سوانح قاسمی"، حصہ اول، دیوبند، ۱۹۵۳ء، ص ۲۹۲۔۲۹۳

۱۵ ایضاً، ص ۲۷۹۔۲۸۳

۱۶ ایضاً، ص ۲۸۶

۱۷۔ خان، سید احمد، ''مقالات سرسید''، جلد ہشتم، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۰۸، ۲۷۹ وغیرہ، خاص مولانا قاسم کی شخصیت اور ان کے کاموں کی ستائش کے لیے: رضوی، محبوب، ''مولانا قاسمی، سرسید کی نظر میں''، مشمولہ: ''برہان''، دہلی، جلد ۱۷، شمارہ ۲، ۱۹۴۶ء، ص ۱۲۰، ۱۲۳؛ مولانا قاسم کے انتقال پر خان، سید احمد، ''تعزیتی مضمون (مولانا محمد قاسم نانوتوی)، مشمولہ: ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ''، ۲۴ اپریل، ۱۸۸۰ء، ص ۴۶۷

۱۸۔ ندوی، اکرام اللہ، ''وقار حیات''، علی گڑھ، ۱۹۲۵ء، ص ۶۰۷

۱۹۔ مدنی، حسین احمد، ''نقش حیات''، جلد دوم، دیوبند، ۱۹۵۳ء، ص ۲۵۷؛ اکرام، ''موج کوثر''، ص ۲۰۳؛ مولانا محمود حسن نے ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی تاسیس کے وقت، ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جو خطبہ پیش کیا تھا، اس کے یہ جملے نہایت اہم ہیں: ''اے نونہالانِ وطن، جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔'' بحوالہ: ایضاً۔

۲۰۔ خان، سید احمد، ''تہذیب الاخلاق''، شمارہ ۱۳۔۱۵، علی گڑھ، ۱۸۷۳ء۔۱۸۷۴ء، ص ۱۷۰

۲۱۔ خان، سید احمد، ''مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز''، مرتبہ محمد فضل الدین، لاہور، ۱۹۰۰ء، ص ۳۴۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۲۳۔ حالی، الطاف حسین، ''حیاتِ جاوید''، ص ۱۹۵

۲۴۔ ایضاً، یہی صورت بعد میں پنجاب یونی ورسٹی میں بھی پیش آئی۔ وہاں بی۔اے اور ایم۔اے کے ساتھ ساتھ بالغ العلوم اور مالک العلوم کے نصاب بھی شروع کیے گئے، لیکن ان نصابوں کا بھی وہی حشر ہوا، جو علی گڑھ کالج میں مشرقی علوم کے شعبہ کا ہوا تھا، بحوالہ: نقوی، نور الحسن، ''سرسید اور ہندوستانی مسلمان''، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۶

۲۵۔ اس کانفرنس نے بعد میں اپنا نام ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' رکھ لیا، اس کے مقاصد اور سرگرمیوں کے لیے: حالی، الطاف حسین، ''حیاتِ جاوید''، حصہ اول، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۲۲۶۔۲۲۷ وبعدہ؛ شروانی، حبیب الرحمٰن خاں، ''پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس''، بدایون، ۱۹۳۷ء؛ اختر الواسع، Education of Indian Muslims: A Study of All India Muslim Educational Conference. علی گڑھ ۱۹۷۷ء

۲۶۔ اس بارے میں راقم کی تالیف: ''تحریک پاکستان کا تعلیمی پسِ منظر'' مفصل مطالعے پر مشتمل ہے۔ ادارۂ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۹۲ء

۲۷۔ باسو، اپرنا، Growth of Education and Muslim Separatism, 1919-1939. مشمولہ: نندا، بی آر، Essays in Modertn Indian History. دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲۷ وبعدۂ؛ و نیز ماتھر، ص ۴۹۔۵۰ وبعدۂ؛ مثلاً ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے دس سالہ عرصہ میں مسلمان طلبہ کی تعداد، کل برعظیم میں پندرہ لاکھ سے بڑھ کر پچیس لاکھ تک پہنچ گئی، ہارڈی، پی، (Hardy, P) The Muslims of British India، کیمبرج ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۵

۲۸۔ قرارداد حکومت ہند، بابت ''ہندوستانی تعلیمی حکمت عملی''، ۲۱ر فروری ۱۹۱۳ء (کلکتہ، ۱۹۱۳ء)، ص ۴۲

۲۹۔ رپورٹ، ۱۹۵۳ء، ص ۹،۶

۳۰۔ حکومت سے ان کی شکایات کا ایک اندازہ "Indian Statutary Commission" کی تعلیمی مجلس کے لیے نور الحق چودھری، رکن مجلس دستور ساز (نواکھالی) کے تیار کردہ بیان سے ہو سکتا ہے، جو علاحدہ بھی شائع ہوا ہے: Notes on Muslim Education، ڈھاکہ، ۱۹۳۸ء، بالخصوص ص ۹۔۱۵

۳۱۔ مہدی پیر پور، راجہ سید محمد، Report of the Enquiry Committee Appointed by the Council of the All India Muslim League to enquire into Muslim Griviences in Congress Provinces. دہلی، ۱۹۳۸ء، ص ۵۳۔۵۴، ۵۶، ۵۸۔۶۰، ۹۳، ۹۶

۳۲۔ "Report of the Kamalyarjung Education Committee" (کلکتہ، ۱۹۴۲ء)؛ بعض مسلم زعماء نے بھی نجی طور پر کانگریس کے تعلیمی منصوبہ اور اس کے نفاذ کے عواقب کا جائزہ و تجزیہ مرتب کیا تھا۔ ان میں ایک جائزہ رازی (غلام احمد پرویز) کا تحریر کردہ ''واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان، ایک عظیم الشان خطرہ سے آگاہی'' (دہلی، سنہ ندارد) تھا۔ اسرار احمد کریوی نے ''سی پی میں کانگریس راج'' (ناگپور، ۱۹۴۱ء) میں اس منصوبہ کے تحت مسلمانوں کے تعلیمی استحصال کی روداد، مسلمانوں کا ردِعمل اور ان کی شکایات مرتب کیں، ص ۱۷۷۔۱۹۹۔ ان کے علاوہ ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اپنی کتاب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' حصہ دوم (پٹھانکوٹ، ۱۹۳۸ء) میں اس منصوبہ پر مدلل تنقید کی ہے۔

۳۳۔ مکتوب نوابزادہ لیاقت علی خاں، بنام افضال حسین قادری، ۲۴ر مئی ۱۹۳۹ء، مشمولہ: ''جدید سائنس'' ڈاکٹر افضال حسین قادری نمبر (کراچی، جون ۱۹۷۹ء)، ص ۲۲۳

۳۴۔ یہ منصوبہ بعنوان: "The Problem of Indian Muslims and Its Solution"، ۱۴ راگست ۱۹۳۹ء کو شائع ہوا تھا۔ مکتوب، افضال حسین قادری بنام چودھری رحمت علی؛ تاریخ ندارد، مشمولہ: ایضاً، ص ۱۲۱۔۱۲۲

۳۵۔ مکتوب، افضال حسین قادری بنام قائداعظم محمد علی جناح، ۲۲ رنومبر ۱۹۴۱ء، مشمولہ: ایضاً، ص ۱۲۶؛ اس تعلیمی مجلس کے قیام کے لیے لیگ کی مجلس عاملہ کی قرارداد اور تعلیمی مجلس کا سوالنامہ، ایضاً، ص ۱۴۲۔۱۴۴ میں ہیں۔

۳۶۔ درانی، ایف کے خان، .A Plan of Muslim Educational Reform، لاہور، ۱۹۳۸ء، ص ۴

۳۷۔ المنہاج (لاہور، ۱۹۴۱ء) خصوصاً ص ۱۶۱۔۱۸۶

۳۸۔ درانی، تصنیف مذکور۔

۳۹۔ ''مسلمانوں کی آئندہ تعلیم'' (دہلی، ۱۹۳۳ء)

۴۰۔ ''نیا نظام تعلیم'' (لاہور، سنہ ندارد)

۴۱۔ ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۰ء

۴۲۔ عزیز، کے۔کے۔ .The Making of Pakistan، لندن، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۱

۴۳۔ اقبال کا یہ خط ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاءاللہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۵۲۲۔۵۳۰ میں شامل ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی

السبیل

یعنے

مجمل یادداشت متعلق اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نوشتہ

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صاحب پریزیڈنٹ شعبہ مذکورہ

حسب الحکم

عالی جناب آنریبل خان بہادر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بی اے، کے سی آئی ای

قایم مقام وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

باھتمام

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپی ۱۹۲۴ء ۱۳۴۲ھ

فہرست مضامین

تمام شد

جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مدظلہم پروفیسر دینیات مسلم یونیورسٹی نے میری تحریک کے جواب میں ایک یادداشت مفہوم اسلامک اسٹڈیز کے متعلق تحریر کی ہے اس یادداشت کے متعلق مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر صدر الصدور امور مذہبی سلطنت حیدرآباد دکن و عالی جناب سر مولوی محمد فخر الدین صاحب بہادر منسٹر ایجوکیشن گورنمنٹ بہار و اڑیسہ و جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب دام اقبالہم پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی مجھ کو اپنی آراء سے مستفید فرمایا ہے میں نے یہ رپورٹ بہ سلسلہ ایک ہدایت کے طلب کی تھی جو عالی جناب آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے لندن جانے کے وقت سپردگی چارج عہدہ وائس چانسلری کے موقع پر نسبت تصفیہ مسئلہ اسلامک اسٹڈیز مجھ کو تحریری و زبانی کی تھی۔

چونکہ اصل یادداشت نوشتہ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات ایک نہایت بیش بہا اور مستقل بالشان تحریر ہے اور ایک معرکۃ الآراء مسئلہ پر خیالات قدیم و جدید کا پورا لحاظ کر کے روشنی ڈالی گئی ہے لہٰذا میں بحیثیت وائس چانسلر و خادم حقیر مسلم یونیورسٹی کے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ کو روشناس قوم کروں اور قوم کو اس معرکۃ الآراء مسئلہ کے افادہ سے محروم نہ ہونے دوں لہٰذا میں اس اصل یادداشت کو مع آراء حضرات موصوف مقدم الذکر طبع کرا کے شایع کرتا ہوں۔

تاکہ اس مسئلہ کے متعلق اگر اور حضرات بھی اپنی آرائے گرامی سے قوم اور اس یونیورسٹی کو مستفید فرمانا چاہیں تو ہم اس استفادہ سے محروم نہ رہیں ۔

نیز بحیثیت ایک حقیر خادم دیرینہ قوم و یونیورسٹی و ادنیٰ ترین طالب علم چند الفاظ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس بارہ میں عرض کرتا ہوں ۔

اگرچہ عالی جناب آنریبل صاحبزادہ صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے اپنے تقرر کے ابتدائی چند ماہ کے اندر ہی اسلامی یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے نظام کی طرف توجہ فرمائی اور مولنا سید سلیمان اشرف صاحب کا بھی احسان ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر ایسی مہتم بالشان رپورٹ لکھی ۔ لیکن ؎

قانع بہ تجلی نہ شود طالب دیدار[1]

پروانہ بمہتاب تسلی نتواں کرد

موجودہ مسئلہ اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم کلکتہ یونیورسٹی کی رپورٹ کے مطابق (ملاحظہ ہو جلد پانچ کے حصہ دوم کے صفحہ ۶۴ و صفحہ ۶۵ کے فقرات ۲۰ و ۲۱) محض اس قدر ہو گا کہ اسلامک اسٹڈیز کو ایک حصہ فیکلٹی آف آرٹس کا قرار دیا جائے ۔ کلکتہ مدرسہ کی تعلیم اور قدامت کا بھی اس میں حوالہ دیا گیا ہے نیز کمیشن مذکور (کلکتہ یونیورسٹی کمیشن) کی جلد دوم باب ۱۶ میں جو تشریح و تنظیم اسلامک اسٹڈیز کی گئی ہے اس میں حسب ذیل دو حصے رکھے گئے ہیں ایک علوم خاص اسلامی اور ایک علوم بیرونی (جو ترجمہ ہو کر عربی زبان میں آئے) ۔ حصہ اول میں مفصلہ ذیل فنون کا :

1. Native Sciences.

1. Koranic Exegesis (Ilmul Tafsir)

2. Koranic Textual Criticism (Ilmul Quirat)

3. Science of Apostolic Tradition (Ilmul Hadis)

[1] صاحب دیدار تجلی پر قناعت نہیں کرتا جیسے پروانے کو چاندنی سے تسلی نہیں ہوتی ۔

4. Guirisprudence (Fikh)

5. Grammar (Nahw)

6. Scholastic Theology (Ilmul Kalam)

7. Lexicography (Lughat)

8. Rhetoric (Bayan)

9. Literature (Adab)

اور حصّہ دوم میں مفصلہ ذیل فنون کا نام لیا گیا ہے۔

2. Foreign Sciences.

1. Philosophy (Falsafah)

2. Astronomy (Ilmul Nujum)

3. Music (Moosiqi)

4. Geometry (Hindisa)

5. Medicine (Tibb)

6. Magic and alcihs (Al Kimiya)

یہ مضامین اور یہ علوم کیسے شاندار ہیں! لیکن ان کی تعلیم بطور محض سطحی مضامین کے اور بذریعہ انتخابات عبارات اور بہ شمول دیگر نہایت دقیق علوم و فنون بزبان انگریزی کے اور بطور شعبہ کلکتہ آف آرٹس کے اور بالآخر بہ طور ایک زائد مضمون اختیاری کے مسلم یونیورسٹی کے کس مرض کی دوا ہو سکتی ہے۔ یا دش بخیر کون یونیورسٹی؟ وہ مسلم یونیورسٹی جس کو نصف صدی سے زیادہ مسلمانوں کے تمام امراض کی واحد دوا کہا جا رہا ہے۔ کون مسلم یونیورسٹی؟ جس کو غرناطہ، قرطبہ، بغداد اور مصر کی یونیورسٹیوں کا قائم مقام کہا جا رہا ہے۔ کون مسلم

یونیورسٹی؟ وہ مسلم یونیورسٹی جس کو نہ صرف مسلمانوں کی ظاہری قومی ضروریات تعلیم کا حلال[1] مشکلات بلکہ مسلمانوں کی روز افزوں دینی خرابی اور تباہی سے بچنے کی تنہا راہ نجات بتایا گیا ہے اور بالآخر وہ مسلم یونیورسٹی جس کی نسبت نہایت شاندار توقعات پیدا کر کے قوم پر جبر ثقیل[2] کا عمل کر کے اخذ زر کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر اس یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کا انتہائی پایہ کلکتہ کمیشن رپورٹ کی تقلید اور پس خوری قرار پائے اور ہمارا انتہائی عروج تعلیم اسلامک اسٹڈیز ہی کورس قرار پائے یا ہمارا مسلکِ تعلیم اسی داغ بیل پر بنے جو کمیشن مذکور نے دی تو میں عرض کرونگا کہ ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملاست
کارِ طفلاں تمام خواہد شد[3]

بہرحال اس وقت جو تجویز اسلامک اسٹڈیز کے نفاذ اور انضباط[4] کی یونیورسٹی میں قائم کی گئی ہے اور جس کا بیان مولانا مدظلہم کی رپورٹ میں ہے اور جس کے باقاعدہ نفاذ کا عالی جناب آنریبل صاحبزادہ صاحب بہادر کو خیال تھا اس کی بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے جو مولانا تجویز فرماتے ہیں اور جس کو اب ہماری اکاڈمک کونسل نے منظور کر لیا ہے اور آئندہ سے اسی پر عمل ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ کچھ بھی نہیں اور مسلم یونیورسٹی اگر درحقیقت اپنے اصلی معانی میں مسلم یونیورسٹی ہے اور اگر دراصل یہ وہی یونیورسٹی ہے جس کی آرزو میں سرسید مرحوم نے جان دی اور جس کے متعلق نواب محسن الملک اور وقار الملک مرحومین نے قوم سے وعدے کیے اور عطیات لیے تو کم سے کم اس یونیورسٹی میں ابتدائی مدارج اسکول[5] وانٹرمیڈیٹ کالج سے لیکر یونیورسٹی کلاسوں تک باقاعدہ و مسلسل اسلامی تعلیم علوم دینی و دنیوی کی عربی زبان میں ہونی چاہیئے اور انگریزی زبان بمرتبہ ثانیہ پڑھائی جاوے اور جس طرح کہ یونیورسٹی کے شعبوں میں آرٹس کالج۔ سائنس کالج۔ ٹیکنیکل کالج۔ ٹرننگ کالج قایم ہوتے ہیں اور ہونگے اس ہی طرح علوم عربیہ اسلامیہ کالج علیحدہ قایم کیا جاوے اور مولانا سید سلیمان اشرف

۱ حلال — بہت مشکل آسان کرنے والا (۲) بہت دور ہونے والا
۲ جبر ثقیل — بھاری بوجھ کو آسانی سے اٹھا لینے کا علم — چرخیوں کا علم (۲) بھاری بوجھ ... [illegible]

صاحب کے سے ماہرین علوم عقلیہ و نقلیہ جو ضروریات موجودہ زندگی سے بھی باخبر ہوں اس کالج کے پرنسپل مقرر کیئے جائیں۔ طلباء کو کافی وظائف دیئے جائیں، فیلو مقرر کئے جائیں، پروفیسر مقرر کیئے جائیں اور مسلم یونیورسٹی کو حقیقی معانی میں غرناطہ، قرطبہ، بغداد اور مصر کی یونیورسٹیوں کا قایم مقام بنایا جائے جہاں سے ویسے ہی فخر قوم و ملت علماء کرام پیدا ہوں جنھوں نے یورپ کی اُستادی کا لقب حاصل کیا تھا اور آج بھی باہمہ شان و شوکت و تعلّی و ترقی یورپ کو ہماری شاگردی کا اقرار ہی میری اس رائے کو پڑھ کر بہت حضرات تو ہنسینگے اور بہت یہ کہینگے یہ شیخ چلی کی کہانی سچ بھی ہو تو روپیہ کے سوال کا کیا حل ہی؟ میں اس کے جواب میں بھی ادب کے ساتھ اور سچے دل سے یہی عرض کرونگا کہ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" ؎

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد[1]

ہمارے پاس اس وقت بھی جو سرمایہ وظائف وغیرہ کے واسطے ہی وہ سب اس اسکیم کے پورا کرنے میں صرف کر دینا چاہیئے اور اس قادر مطلق کے فضل پر بھروسہ کرکے جس کے بھروسے پر سر سید اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے نیست کو ہست کا وجود دلوایا، کمر ہمت کو باندھنا چاہیئے اور اسکیم عربک اسلامک کالج کو بسم اللہ کرکے شروع کر دیا جائے اور پھر ملک و قوم سے اپیل کی جائے تو باہمہ بے حالی و خستہ مالی اب بھی خدا کے بندے، بندگان خدا کی مدد کو تیار ہو جاوینگے اور کیا عجب ہی کوئی ایک خضر راہ[2] ایک گوشۂ ملک سے پیدا ہو کر اس قومی کشتی کو گرداب بلا سے باہر نکال دے۔ کوئی صاحب دل تاجر کوئی ایک دولتمند بمبئی، کلکتہ یا سورت سے ہی ایک گوشۂ چشم ہمارے اس درد کی ایسی دوا کر دے جس سے مریض قوم شفا پا جاوے

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند[3]

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

[1] جو کام ہمت سے [illegible] کیا جائے۔ اگر وہ کانٹا بھی ہو تو گلدستہ بن جاتا ہے۔ [2] خضر راہ - راہبر، راہنما [illegible]
[3] وہ لوگ جو اپنی نظر سے مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں۔ کیا ایسا ہوگا کہ ان آنکھوں سے ہماری طرف بھی دیکھیں گے۔

اس ضمن میں حضور نظام عالی مقام خلد اللہ تعالیٰ ملکہم و دولتہم و ضاعف اللہ اقبالہم و مراتبہم کی اُس کامیاب عالی شان اور مفید اسکیم کا حوالہ بلکہ اس کی تقلید کا مشورہ دینا ضروری ہے جو باعثِ اجرائے اُردو یونیورسٹی ہوئی ہے اور اسی شاہراہ پر علیگڈہ اسلامی کالج کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

خاکسار

محمد مزمل اللہ خاں

(خان بہادر نواب و بی اے کے سی آئی ای)

انچارج وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

میں نے مولوی سلیمان اشرف صاحب کا نوٹ پڑھا۔ اسلامک اسٹڈیز کے دو حصے ہیں اوّل دینیات۔ دوم سائنس و فلسفہ و تاریخ وغیرہ۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں صفحہ ۱۰۰ پر اسلامک اسٹڈیز کا خاکہ بیان کیا ہے اور اس میں وہ تمام مضامین ہیں جو ہم دینیات کے تحت میں پڑھاتے ہیں۔ اس کمیٹی میں بحث اس بات پر ہوئی تھی کہ ان طلبا کو جو اسلامک اسٹڈیز لیں کیا ڈگری دینی چاہیے بی اے یا بی آئی .B.I اکثر لوگ .B.I کی ڈگری کے مخالف تھے کہ .B.I اور .B.A میں تفریق کرنے سے ان طلبہ کی قیمت جنھوں نے اسلامک اسٹڈیز میں ڈگری حاصل کی ہے کم ہو جاوےگی اسلامک اسٹڈیز کا مسئلہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں کلکتہ یونیورسٹی کے سامنے بھی پیش ہوا اور انھوں نے یہ سفارش کی کہ اسلامک اسٹڈیز کے سند یافتوں کو .B.A کی ڈگری ملنی چاہیے اور اسلامک اسٹڈیز .B.A کی تعلیم کے لیے بھی ایک مضمون ہونا چاہیے (دیکھو صفحہ ۱۸۲ جلد ۴ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ) اس کے ساتھ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے باب نمبر ۴۲ جلد ۵ میں اسلامک اسٹڈیز پر دوبارہ

بحث کی ہے اور جو مفہوم اسلامک اسٹڈیز کا انھوں نے قایم کیا ہے وہ حسب ذیل ہے (سکشن ۲۰ اور ۲۱ صفحہ ۴۶ و ۶۵ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ)

ان ہی مندرجہ بالا سفارشوں کی بنا پر گورنمنٹ آف انڈیا و ڈھاکہ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قانون میں اسلامک اسٹڈیز کا ایک علٰحدہ مضمون قایم کیا گیا ڈھاکہ یونیورسٹی نے ایک لیکچرار قدیم ریاضی اور قدیم ہیئت پر مقرر کیا ہے مگر اس وقت تک اسلامک اسٹڈیز کا مکمل کورس باستثنائے مندرجہ بالا نہیں بنا سکے۔ یہ کہنا کہ مسلم یونیورسٹی میں اس وقت کوئی شخص اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا غالباً صحیح نہیں ہے۔ راز کے افشا کی معافی مانگتے ہوئے میں یہ کہونگا کہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ میں دونوں باب جو مشرقی تعلیم کے متعلق ہیں وہ میرے ہی لکھے ہوئے ہیں ہم کو اسلامک اسٹڈیز میں بالفعل دو شعبے قایم کرلے چاہئیں اوّل تاریخ دوم فلسفہ اور جلد سے جلد اگر مالی حالت اجازت دے تو ریاضی اور ہیئت کا شعبہ قایم کر دینا چاہیئے جس میں طبیعات بھی شامل ہونگے۔ مولوی سلیمان اشرف صاحب نے جو نوٹ لکھا ہے اس میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے منشا کی توسیع کی ہے اور مجھے اس سے اتفاق کلی ہے۔ اسی اصول پر اسلامک اسٹڈیز کا کورس بننا چاہیئے۔

ضیاء الدین احمد

(ایم اے، ڈی ایس سی، پی ایچ ڈی انیویٹن اسکالر سی آئی ای ایم ایل سی) پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

میں نے مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کا نوٹ "اسلامک اسٹڈیز" کے متعلق اور اس پر پرو وائس چانسلر صاحب کی رائے پڑھی۔ میری رائے حسب ذیل ہے۔

(الف) سب سے اوّل یہ طے کرنا ہے کہ مسلم یونیورسٹی اسلامی علوم کیوں پڑھاتی ہے یا کیوں پڑھانے چاہئیں؟ اس کے بعد یہ طے کرنا ہے کہ کیا پڑھانا چاہیئے؟ سوال کا

جواب یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی برطانوی ہند میں ہے اس لیے اس وقت سے جب
اس کا وجود صرف ذہن میں تھا یہ عدہ واثق ملک سے درملت سے کیا ہے کہ علوم اسلامیہ اور علوم مشرقیہ
کی تعلیم کا اہتمام مثل دوسرے علوم کے اس میں کیا جائیگا۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے فراہمی سرمایہ
کے وقت کوئی اہم تحریر یا تقریر ایسی نہ تھی جس میں وعدہ مذکور کا اعادہ پوری وضاحت یا اعلان کے
ساتھ نہ کیا گیا ہو اسی دوران میں جو کمیٹیاں مسلم یونیورسٹی کے سیلبس بنانے کے لیے مقرر ہوئیں اور جن میں
مسلمان ماہران تعلیم شریک رہے انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ تمامی علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم کو مسلم
یونیورسٹی کی تعلیم کا جزو قرار دیا۔ اور اسی بنیاد پر تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام وغیرہ علوم اسلامیہ کے سیلبس علمائے
عرب کے مشورہ سے بنائے اور ملک کو دکھائے۔ انہی وعدوں کی بنیاد پر مسلمانوں نے چندہ دیا اور سرمایہ مسلم یونیورسٹی
فراہم ہونے میں کامیابی ہوئی اگر یہ وعدہ واثق نہ ہوتا تو یہ واقعہ ہے کہ کافی مطلوبہ سرمایہ فراہم نہ ہوتا اب جب کہ
مسلم یونیورسٹی قایم ہوچکی تو ہمارا فرض ہے کہ وعدہ کو پورا کریں سرمایہ کا مساوی حصہ علوم اسلامیہ کی تعلیم میں صرف
کریں۔ یہ عدہ مشروط نہ تھا ڈھاکہ یونیورسٹی کی تجاویز یا کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی آرا کی پابندی کے
ساتھ۔ لہٰذا اس موقع پر ان تجاویز اور آرا کا حوالہ دینا یا ان کی پابندی لازم کرنا خارج از بحث ہے۔

(ب) مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قایم کردہ درسگاہ ہے جو خصوصاً مسلمانوں کے لیئے قائم ہے۔
اس میں علوم اسلامیہ اور مسلمانوں کے علوم کا ایسا اہتمام ہونا جو دوسری درس گاہوں سے فائق اور
ممتاز ہو بالکل حق بجانب اور اصول تقسیم عمل کے مطابق ہے جب مسلمان دوسری درسگاہوں میں جا کر
یا اپنی درسگاہ میں دوسرے علوم کے علما کو بلا کر علم حاصل کرتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنی درسگاہ
میں اسلامیہ علوم کی تعلیم کا ایسا اعلیٰ اہتمام کریں کہ تشنہ لبانِ علوم یہاں آکر سیراب ہوں اور اس طرح
مسلم یونیورسٹی کا اطلاق صحیح طور پر علی گڑھ کی درس گاہ پر ہو۔

(ج) سب سے اہم اور ضروری یہ امر ہے کہ علوم اسلامیہ وہ علوم ہیں جو کلام ربانی اور ارشادات
نبوی کا مخزن ہیں، ان کے سیکھنے پر مسلمانوں کی دنیا اور آخرت کی بہبودی منحصر ہے اس صداقت کو ہر اس
مجمع اور درس گاہ کو پیش نظر رکھنا فرض ہے جو مسلمانوں کی تعلیم کی مدعی ہو۔ انسانی تاریخ

کے ڈیڑھ ہزار سالہ تجربہ نے بتلا دیا کہ نبی نوع انسان کی حقیقی ترقی اور عظمت اسی تعلیم پر منحصر ہے لہٰذا جو مسلمانوں کی درس گاہ ان علوم کی تعلیم میں پورا اور ضروری اہتمام نہ کرے وہ مسلم درس گاہ یا مسلم یونیورسٹی کے لقب کی مستحق نہیں ہو سکتی اور کہہ سکیں گے کہ اس نے نوع انسانی کی خدمت نہیں کی اور وہ امانت ادا نہیں کی جو اس کے ذمّہ تھی۔

جب یہ طے ہو لیا کہ کیوں مسلم یونیورسٹی علوم اسلامیہ پڑھائے تو اب یہ طے کرنا ہے کہ کیا پڑھانا چاہیئے۔ بہترین حل اس کا عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہے۔ اس کا کیلنڈر منگوا کر دیکھ لینا چاہیئے۔ ایک گھنٹہ کا مطالعہ واضح کردے گا کہ کیا پڑھانا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ مسلم یونیورسٹی میں دو فیکلٹی ہوں ایک سائنس اور آرٹس کی ایک علوم اسلامیہ کی۔ جس طرح آرٹس اور سائنس کی تعلیم کا اہتمام ابتداء سے ہے اور اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح شعبۂ علوم اسلامیہ کا اہتمام ابتداء سے انتہا تک ہو۔ انگریزی لٹریچر کی تعلیم ابتداء سے انتہا تک لازم ہو ڈگریاں دونوں شعبوں کی ایک نام سے ہوں۔ دونوں ڈگریوں کی قیمت ایک ہو۔ استادوں کی تنخواہ کا ایک معیار ہو۔ طلباء کے وظائف وغیرہ بالکل یکساں ہوں۔ دونوں شعبوں کے اساتذہ اور طلبا میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ پرو وائس چانسلر ایک ہو جو دونوں شعبوں کے افسری کی قابلیت رکھتا ہو۔ اس کی تشکیل کے لیے ایک بورڈ بنایا جائے جس میں مسلم یونیورسٹی قدیم مدارس عربیۂ ندوۃ العلماء اور جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور تعلیم یافتہ شریک ہوں۔ اکیڈمک کونسل میں علوم اسلامیہ کا عنصر اس قدر رکھا جائے جو اپنی تجاویز کو قوی کر سکے اور اس میں بھی مثل دوسرے علوم کے ماہرین کی رائے مسلم مانی جائے۔

اول یہ دونوں اصول طے کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد علوم اسلامیہ کی تعلیم کا دعویٰ کرنا چاہیئے۔ علوم اسلامیہ کی تقسیم دینیات اور اسلامک اسٹڈیز میں ڈھاکہ یونیورسٹی یا کلکتہ یونیورسٹی

کمیشن کی تجاویز کی پابندی یا اسی سلسلے میں کلکتہ مدرسہ یا اس کی شاخوں کا ذکر ضمانت ہے ناکامیابی اور علوم اسلامیہ کی قدر و قیمت نہ قائم کرنے کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی اور کلکتہ یونیورسٹی کے مقاصد و اغراض اور فرائض مسلم یونیورسٹی کے مقاصد و اغراض سے بالکل جدا ہیں۔ اس صورت میں اُن کی تجاویز علوم اسلامیہ کے متعلق ہماری رہبر کیوں ہوں ہم کو رہنما ہونا چاہیے نہ پیرو۔ کلکتہ مدرسہ نے جو نتائج اب تک اپنی تعلیم کے دکھائے ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

بہرحال میرا ناچیز مشورہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی اُس کی مثال کو نمونہ نہ بنائے۔ پچاس سال کے تجربہ نے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے دماغ جس قدر علوم اسلامیہ اور علوم مشرقیہ سے دور ہونگے، اسی قدر علمی اور عملی قوت ان کی کمزور اور زوال پزیر ہوتی جائیگی۔ اس کی شہادت روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

۵ رجولائی سنہ ۱۹۲۴ء
حبیب گنج

محمد حبیب الرحمٰن خاں
(نواب صدر یار جنگ بہادر، صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی حیدرآباد دکن)
ممبر کونسل و کورٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

---

(۴)

عربی کی تعلیم جس طرح پر عموماً اسکولوں اور کالجوں میں ان دنوں دی جاتی ہے وہ میرے خیال ناقص میں محض ناکافی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں لڑکوں کو صرف ایک گھنٹہ عربی کی تعلیم دی جاتی ہے اور ایم اے تک جو تعلیم کسی طالب علم کی ہوتی ہے وہ بمقابلہ ان طلبا کے جو عربی علوم کے مدارس میں تعلیم پاتے ہیں محض ناکافی ہوتی ہے مجھکو اپنے صوبے میں اکثر ایسے حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جنہوں نے بلا وساطت کسی عربی مدرسہ کے صرف اسکول اور کالجوں میں

عربی بطور سیکنڈ لینگویج پڑھ کر ایم اے کی ڈگری عربی میں حاصل کی ہے لیکن میں نے یہ پایا ہے کہ اُن کو درحقیقت عربی کی لیاقت ہرگز اس حد کی نہیں ہے جو ایک عربی مدرسہ کا تعلیم یافتہ لڑکا حاصل کرتا ہے۔ میرے خیال میں اگر واقعی عربی کی تعلیم پورے طور سے دینا کسی طالب علم کو منظور ہو تو اس کے لئے پورا سامان تعلیم کا ہونا چاہیئے۔ میں نے ایک علی گڑھ کے پاس شدہ کی نسبت جنھوں نے عربی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور جن کو ہمارے صوبے کے کسی حصے میں پروفیسری کی خدمت ملی تھی میں نے اسی قسم کی شکایت سنی تھی۔ میں نے مولانا سلیمان اشرف صاحب کی تحریری رائے جو ہنوز چھپی نہ تھی مطالعہ کیا ہے اور مجھکو اُن کی رائے کے ساتھ پورا اتفاق ہے۔

فخرالدین (بی اے ایل ایل بی نائٹ)
منسٹر آف ایجوکیشن بہار و اڑلیسہ

مراسلات منسلکہ رپورٹ

مخدوم و مطاع ذو المجد و العلا آنریبل سر نواب صاحب ادام اللہ فیوضکم علینا

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

حضور والا نے کھلی مجلس کونسل میں اجرائے اسلامک اسٹڈیز کے متعلق حکم ناطق صادر فرمایا پھر جب لیڈر اخبار نے اپنا نوٹ شائع کیا ہے اس وقت سے جو پیہم متنبہ کرنے والی یاددہانیاں پہنچتی رہی ہیں وہ مزید برآں حکم ہیں۔

مخدوما! تاخیر کی علت یہ تھی کہ مسودہ خوشنویس کے پاس صاف ہونے کے لئے گیا ہوا تھا۔ آج رپورٹ متعلق اسلامک اسٹڈیز مع عرضداشت و نوٹ بصیغہ ضابطہ خدمت والا میں ارسال ہے اسے ملاحظہ فرمانے کے بعد جو حکم ہوگا اس کی تعمیل بسر و چشم کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔

حررہ بقلمہ۔ دعاگو

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

۳۰ رمئی ۱۹۲۴ء

(۲)

بگرامی خدمت عالی جناب آنریبل وائس چانسلر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جناب والا

نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ لیڈر اخبار مسلم یونیورسٹی پر اسلامک اسٹڈیز کے صرف بے جا کے متعلق جو حملے کر پے بہ پے کر رہا ہے

اور جس کی بنیاد وائس چانسلر آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بالقابہ کے نوٹ کو قرار دیتا ہے اور جس کی اشاعت و طبع کی اس مرتبہ اس نے دھمکی دی ہے وہ نوٹ اس عریضہ کے آخر میں منسلک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ممبرانِ اکاڈمک میں بیرونی اشخاص بھی ہیں اس لئے ہر وہ تحریر جس کی اشاعت باضابطہ ہوگی وہ اطراف ملک میں ضرور پہنچے گی جسے اغیار و معاندین اگر اپنے مطلب کا پائیں گے تو اُسے ایک سند قرار دے کر حملہ آور ہونگے۔

عالی جاہا! مجھ جیسے ادنیٰ ملازم کو اس کا ہرگز حق حاصل نہیں کہ وہ وائس چانسلر صاحب کے نوٹ پر کسی طرح کا تبصرہ یا تنقید کرے اس لئے کہ ماتحتی کا اقتضا انقیاد و اطاعت ہے لیکن اُس سبب کے بیان کرنے کی مودبانہ اجازت چاہتا ہوں جو اس نوٹ کے تحریر کا باعث ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مصداق اسلامک اسٹڈیز کے سمجھنے میں چونکہ مسامحت واقع ہوئی (جیسا کہ میری یادداشت ہٰذا سے واضح ہوگا) اس لئے عالی جناب وائس چانسلر صاحب اسلامک اسٹڈیز کی جستجو فرماتے تھے۔ میں عرض کرتا تھا کہ ایک شاخ اس کی یونیورسٹی میں موجود ہے اُس کی ترتیب و تہذیب کر کے صحیح اصول پر جاری کر دیجئے۔ میں اس کی صحت کے لئے اصول و ضوابط تیار کر رہا ہوں اس کے بعد ایک ایک شاخ کے اصول و ضوابط جیسے جیسے مرتب ہوتے جائیں اُن کا افتتاح ہوتا جائے تا آں کہ دو سال میں کل مفید شعبے مرتب ہو کر جاری ہو جائیں گے۔ سردست ایک ہی شعبہ کا اجرا کفایت کرتا ہے یہ شاخ فن ادب کی تھی اس کی کیا حالت یونیورسٹی میں ہے اور میں اس کی اصلاح کے متعلق کیا لکھنا چاہتا تھا نیز یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کی اہم و انفع یہ شاخ ہے یا نہیں اس کی تفصیل اسی یادداشت میں مسطور ہے لیکن مختصراً ایک رپورٹ مع تصدیق مولانا عبدالحق صاحب وائس چانسلر صاحب

کی خدمت میں ماہ فروری پیش کر چکا ہوں۔

لیکن میری عرضداشت جب کہ شرف قبولیت سے محروم رہی اور مجھ پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اسلامک اسٹڈیز کے مفہوم سے میں خالی الذہن ہوں اس وقت مجھے اس مفید تالیف و تصنیف کو جس کا تعلق فن ادب سے تھا ملتوی کرنا پڑا اور رفع الزام کے لئے ایک مختصر یادداشت جو آج آں جناب کی خدمت میں ارسال ہی لکھ کر کونسل میں پیش کر دی گئی۔ لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا۔ کہ اب کہ رپورٹ سے فارغ ہو چکا ہوں اُس مفید کتاب کا تکملہ بغرض اجرائے اسلامک اسٹڈیز کرنا ضروری اس کی ضرورت کا سمجھنا عہدہ اور منصب سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا علاقہ علم و فن کے ساتھ ہے۔ نیابت علم مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں اُس کی حمایت کروں اور اپنی رائے کی آزادی کو قائم رکھوں۔

(۲)

عالی جناب وائس چانسلر صاحب کے جناب میں بے شک میں نے یہ سوال پیش کیا تھا کہ تعلیم اسلامک اسٹڈیز کی نوعیت یہاں کیا ہوگی آیا جس طرح دینیات کی تعلیم یہاں سالہا سال سے ہو رہی ہے اس کی وہی نوعیت ہو گی یا اس کی تعلیم میں حقیقت و دقعیت کا لحاظ رکھا جائے گا اگر شق ثانی مرکوز خاطر ہے تو پھر اسٹاف بڑھانا ہوگا اور دیگر ضروریات کے لئے کافی رقم درکار ہو گی۔ کیا یونیورسٹی اس کے لئے آمادہ ہے؟

(۳)

دوسرا سوال یہ تھا کہ اسلامک اسٹڈیز انگریزی تعلیم کے پہلو بہ پہلو ہو گی یا ایک کا پایہ کچھ کلاس کے بعد گراں کر دیا جائے گا یا کوئی اور طریقہ ہو گا؟ اس کے جواب میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ اس کا فیصلہ ڈیپارٹمنٹ کرے گا۔ الغرض جو کچھ استفسار میں نے کیا تھا

اس میں کوئی سوال میری جہالت اور نادانی سے مشعر نہ تھا بلکہ ہر ایک کا منشا اس امر کا دریافت کرنا تھا کہ تعلیم گہری اور استوار ہوگی یا آرائشی و ملمع تاکہ اسی لحاظ سے نصاب وغیرہ طیار رہو۔

عریضۂ ادب۔ آپ کا فرماں بردار
فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ
چیرمین اسلامک اسٹڈیز
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۵ رمئی ۱۹۲۴ء

مجمل یادداشت

متعلق

اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلامی سلطنت اور علوم اسلامیہ کا زوال

ہندوستان سے جب مسلمانوں کی رہی سہی سلطنت بھی فنا ہوگئی تو دفعتہً اُن کے قلب پر ایسا صدمہ پہنچا کہ دل و دماغ اُن کے بالکل ماؤف ہو گئے عقل خیرہ ہوگئی اور حواس پراگندہ۔ اس سراسیمگی میں انھیں قطعاً اس کا احساس نہ رہا کہ کس شے کو اخذ کرنا چاہیے اور کس چیز کو ترک کرنا چاہیے حیران و ششدر تھے قوت تمیز و بیکار ہو رہی تھی اُس بیہوشی میں بہت سے قابل ترک امور اختیار کر لیے گئے اور جنھیں کسی حال میں بھی ترک کرنا روا نہ ہو سکتا تھا انھیں قطعاً چھوڑ بیٹھے انھیں فرو گذاشتوں کی فہرست میں بہت جلی قلم اور نمایاں حروف میں علوم اسلامیہ کا ترک بھی مندرج ہو گیا۔

عربی سے وحشت

مسلمانوں نے خیال کیا کہ جب اپنی سلطنت اپنے علوم کی محافظت کے لیے نہ رہی تو پھر اس قدیم کی پرورش ایک مفتوح قوم اور محکوم رعایا کے لیے کسی طرح سازگار نہیں ہو سکتی اس غلط خیال کا استیلا یوماً فیوماً ایسا ہوتا گیا کہ آخر مسلمانوں کو عربی کے نام سے وحشت پیدا ہو گئی۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اس بے بنیاد خیال نے چند ایسے مغالطہ آمیز، غیر واقعی اعذار پیدا کر دیئے جنھوں نے وحشت و بیگانگی کو اور بھی پختہ کر دیا۔ مثلاً عربی کے قواعد بہت ہی سنگلاخ ہیں صرف و نحو کی تعلیم مدت مدید چاہتی ہے عربی زبان بذات خود ایسی مشکل زبان ہے کہ ہندوستانیوں کو برسوں میں بھی نہیں آتی ہے علوم عربیہ سے تربیت دماغی نہیں ہوتی عقل کی روشنی ذہن کی صفائی حوصلہ کی بلندی اور عزت نفس وغیرہ وغیرہ علوم عربیہ سے قطعاً حاصل ہو نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں اب کہ دور حکومت انگریزی ہے ہر طرح کی ملازمتوں اور ہر طرح کے کاروبار پر انگریزی زبان کی مہر ہے عربی پڑھ کر نہ صنعت و حرفت کو فروغ دے سکتے ہیں نہ کسی عہدہ و منصب کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں نہ کسی پیشہ میں نمود کی زندگی اختیار کر سکتے ہیں پھر ایسے علم کا خیال بھی وقت کا برباد کرنا اور قوت متخیلہ کے اعمال کا رائیگاں کرنا ہے۔

انھیں بے بنیاد حقیقت سے دور اور اصلیت سے بے تعلق باتوں نے آج ہندوستان کے مسلمانوں سے علوم عربیہ کو ایسا اجنبی بنا دیا ہے کہ بڑی سے بڑی مجلس جو مسلمانوں کی منعقد ہوتی ہے اس میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جسے صحیح معنوں میں علوم اسلامیہ کا حامل درازدار کہا جا سکے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔

چند لبِ بام علمی آفتاب

اس استثنار کی ابھی گنجائش یوں ہے کہ چند ہستیاں ہنوز ایسی موجود ہیں جو صحت استعداد اور جدید مطالعہ کے ساتھ اپنے فیض علم کو طالبِ صادق تک متعدی کر سکتی ہیں۔ لیکن ان حاملان علم کی مثال آفتاب لب بام کی ہے اپنی زندگی کا دور پورا کر چکے ہیں اور ہماری بدشوقی و بدنصیبی کا منحوس منظر دیکھتے دیکھتے ایسے تھک گئے ہیں کہ زاویہ عزلت میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز اور اپنے رب قدیر کی جناب میں مصروف دعا گوئی امت مرحومہ ہیں کاش اب بھی مسلمان بیدار و متنبہ ہوں اور ان متبرک ہستیوں کے سینہ میں جو زر و جواہر کا خزینہ مکنون ہے اور وہ صرف انھیں مسلمانوں کی

بے بہا میراث ہے اُسے تہ خاک ہونے سے بچالیں تو اُن کی قومیت کچھ دنوں تک اور بھی بقا کا فیض پاسکے گی۔ ورنہ جب یہ آفتاب غروب ہوجائیگا تو پھر تاریک شب کی سیاہی مسلمانانِ ہند کی قومیت پر ایسی چھاجائیگی کہ چراغ و شمع کا تو کیا ذکر برقی روشنیاں بھی اُن کے خط و خال اور شکل و صورت کو عیاں نہ کرسکیں گی یہ ایک ایسا خطرہ ہستی سوز ہے جسے ہر ذی فہم نے محسوس کیا ہے اور گروہ تعلیم یافتگان علوم مغربیہ اب اس کی منادی کررہا ہے ان کی یہ صوت و صدا دل سے ہے یا زبان سے اس کا علم عالم الغیب کو ہے یہ فقیر بے بضاعت تو ہر ایسی ندا پر حافظ کا یہ شعر پڑھ دیتا ہے ؎

خلقے زبان بدعوئ عشقش کشادہ اند
اے من فدائے آنکہ دلش با زبان یکیست [1]

خطرہ تیس سال قبل محسوس کیا جاچکا تھا

یہ خطرہ جس سے محفوظ رہنے کے لیے اب انگریزی داں نے آواز بلند کی ہے اُسے آج سے تیس پینتیس برس قبل علماء ملت نے محسوس کیا تھا اور اپنی وسعت و گنجائش کے مطابق اس کے انسداد کے لیے مستعد و آمادہ بھی ہوئے اور ایک حد تک کچھ عرصے کے لیے کامیاب بھی ہوگئے لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کا دور کچھ ایسی منحوس ساعت میں شروع ہوا تھا کہ باوجود پیہم کوششوں کے بھی اصل مقصد میں اس وقت تک حقیقی کامیابی حاصل نہ ہوئی اگرچہ ان مساعی جمیلہ کا اس قدر نتیجہ تو ضرور ہوا کہ اصل خطرہ عام طور پر ہر پڑھے لکھے مسلمان کے سامنے آگیا اور اس کے صحیح انسداد کا جو طریقہ کہ علماء ملت نے قرار دیا تھا وہ ہر خاص و عام میں مقبول ہوا لیکن ان کی رہنمائی کہیں تو ابتدائی مراحل سے آگے بڑھنے نہ پائی اور کہیں منزل سے قریب ہوکر رجعت قہقری کی جانب مائل ہوگئی عمل کی طاقت سست ہوگئی اور گفتگو میں سرعت و تیزی پیدا ہوگئی باتیں بہت ہونے لگیں اور کام کی طرف سے بے توجہی ہوگئی اس میں رہ نورد راہ رو کی خطا ہے رہبر کی رہنمائی میں قطعاً غلطی نہیں ؎

۱؎ مخلوق نے اس کے عشق کے دعوے میں زبان کھولی۔ میں تو اس پر قربان ہوتا ہوں جس کا دل اور زبان ایک ہے۔

۲؎ [illegible]

کہیں فکرِ تدابیرِ سفر سے راہ کٹتی ہے
قدم ہی جب نہ اُٹھیگا رہیگا فاصلہ باقی

یہ ایک واقعہ ہے کہ قوائے دماغیہ اور قوائے جسمانیہ دونوں کے وظائف جس طرح کہ متغائر ہیں ویسا ہی ان دونوں کے مطالبات میں بھی تغایر پایا جاتا ہے اس وقت تک کہ مسلمانوں کی حکومت وسلطنت تھی علوم عربیہ سے اگر مطالبات دماغیہ پورے ہوتے تھے تو جسم وجسمانیت کا انتظام بھی انھیں سے انجام پاجاتا تھا لیکن انگریزی حکومت کا دور جب آغاز ہوا تو مطالبات جسمانیہ کا انصرام آہستہ آہستہ انگریزی تعلیم میں منحصر ہو گیا اب اگر خصوصیت ملی اور امتیاز قومی کی حیات تشنۂ آبِ علوم اسلامیہ تھی تو قوام جسم کا نظام اپنے بقا اور نمو کے لیے انگلش زبان کا بھوکا تھا حکماء امت کی دوربین نگاہوں نے اسے دیکھا اور عربی مدارس کے اصول تعلیم میں تغیر وتبدل کے لیے آمادہ ہو گئے خالص مدارس عربیہ میں کچھ انگریزی کی تعلیم داخل کی گئی اور نیز طریقۂ تعلیم میں بھی سہولت کی راہ پیدا کی گئی فقیر کے علم میں سب سے پہلے

مدرسہ احمدیہ آرہ نے اس کی بنیاد رکھی صرف ونحو کی بعض کتابیں سہل اصول پر تصنیف ہو کر وہاں سے شائع ہوئیں اور کچھ انگریزی کا سیکھنا لازم قرار دیا گیا۔

ندوہ اس کے بعد مجلس ندوۃ العلماء قائم ہوئی جس نے زیادہ اہتمام کے ساتھ مسئلہ تعلیم پر ہر پہلو سے غور وخوض کرنا شروع کیا اس میں کچھ شک نہیں کہ جس نہج پر علماء ندوۃ العلماء نے اپنی سعی کا قدم بڑھایا تھا وہ منزل رساں اور موصل الی المطلوب تھا لیکن افسوس اس کا ہے کہ اس وقت اُن کی کوششیں تفصیل کے ساتھ ملک وقوم کے سامنے موجود نہیں اس لیے بہت سی مشکلات ایسی ہیں جو اُس وقت حل ہو گئی تھیں لیکن اسی بیس پچیس برس کے الٹ پھیر میں پھر وہ علیٰ حالہا قائم ہو گئیں۔

مثلاً برسوں ندوۃ العلماء میں اس پر گفتگو رہی کہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں وقتاً فوقتاً کیا تغیر پیدا ہوتا رہا اور ہر تغیر کے کیا ثمرات ونتائج ظاہر ہوئے۔ یہ عظیم الشان

کثیر المنفعت بحث تھی لیکن افسوس کہ اس وقت بخت و اتفاق سے جو کچھ موجود ہے وہ بہت ہی نامکمل ہے اگر علماء کرام کی اُن تمام مساعی جمیلہ کا ذخیرہ موجود ہوتا تو درس گاہوں کو اپنے درس کی غایۃ اور نصاب مقرر کرنے میں بہت بڑی سہولت ہوتی۔

مثلاً ایک مضمون مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم مغفور کا ۱۳۲۷ھ کے الندوہ میں چھپ کر شائع ہوا تھا اس میں مولانا موصوف نے یہ بتایا ہے کہ ساتویں صدی ہجری سے اس وقت تک علوم اسلامیہ کا ہندوستان میں کیا نصاب تعلیم رہا ہر سو برس بعد ہندوستان کے طریقۂ تعلیم اور کتب نصاب میں کیا تغیرات واقع ہوئے معیار فضل و کمال ہر صدی میں کیا رہا۔

یا مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کا ایک رسالہ ہے جس کا نام علماء سلف ہے اس میں عہد سلف کے طریقۂ تعلیم اور مقصد تعلیم سے بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ عہد سلف میں جن باکمالوں نے تحصیل علم سے فراغت پائی اُن کا وجود ملک کے لیے قوم کے لیے مذہب کے لیے علم کے لیے اور سلطنت و حکومت کے لیے کن کن پہلوؤں سے برکت اور رحمت ثابت ہوا صرف انھیں دونوں مضمونوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ مباحث اور علمی کارنامے جو مشاہیر علماء ہند نے اس وقت ترتیب دئے تھے اگر سب کے سب موجود ہوتے تو اس وقت ایک گراں بہا سرمایۂ علمی ہمارے ہاتھوں میں ہوتا۔

بہر حال ندوۃ العلماء نے اپنا ایک مقصد قرار دیا اور اسی کے بموجب چند سال کی پیہم کوششوں کے بعد اپنا ایک نصاب تعلیم اُس نے قرار دیا اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انگریزی تعلیم وہاں اسی قدر ہے جس قدر مڈل اسکول انگریزی میں ہوا کرتی ہے۔ اصل تعلیم علوم اسلامیہ کی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی ترتیب و تہذیب اور تعیین نصاب میں چار پانچ برس ان اکابر علماء کے صرف ہو گئے جن کے کمال کا علو اور علمی شان کی رفعت کسی صاحب تمیز کے لیے محتاج برہان و دلیل نہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی ندوۃ العلماء کے بعد پھر کوئی تحریک حلقۂ علماء میں پیدا نہ ہوئی اس کے

بہت سے اسباب و علل ہیں منجملہ ان کے خاص وجہ یہ ہے کہ کثیر تعداد علماء کامل الفن کی جن کے سینوں میں علوم اور دلوں میں امت مرحومہ کی سچی خیر خواہی تھی وہ زیر خاک پنہاں ہو گئی لیکن یہی تحریک گروہ تعلیم یافتگان علوم مغربیہ میں آہستہ آہستہ کارفرما ہونے لگی علوم اسلامیہ کی حمایت میں اب انگریزی داں اصحاب اپنی آواز بلند کرنے لگے تقریر و تحریر میں اس کی اہمیت و ضرورت پر توجہ دلاتے تعلیم قرآن اور فہم معانی قرآن پر تشویق و ترغیب آمیز مضامین لکھتے قومی تقریروں اور قومی خطبات میں آیات کلام الٰہی اور احادیث نبوی کا اقتباس کرتے یہاں تک کہ مسلمانان بنگال اپنے قول کو عمل میں لانے کے لیے آمادہ و مستعد ہو گئے استحکام عمل کے خیال سے برسوں مشورہ رہا مختلف علما اور مستشرقین سے تبادلہ خیال ہوتا رہا متعدد بار مجلس شوریٰ قائم ہوئی تاآں کہ ڈھاکہ یونیورسٹی جب قائم ہوئی تو وہاں اسلامک اسٹڈیز کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا بعض اہل علم کی خدمات تعلیم کے حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی نے اسلامک اسٹڈیز یعنی علوم اسلامیہ کی تعلیم کا اپنے جامعہ میں یہ مقصد قرار دیا کہ علوم اسلامیہ میں یہاں کے فارغ التحصیل کو وہی سکہ حاصل ہو جو درس نظامیہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں اب سے چالیس پچاس برس قبل ہوا کرتی تھی اسی کے ساتھ انگریزی علم ادب بی اے تک انھیں پڑھایا جائے تاکہ ان کی قیمت کسی بی اے سے کم نہ ہو سکے لیکن کلکتہ کمیشن رپورٹ انھیں بی اے کہنے سے پس و پیش کرتی ہے اس لئے کہ صرف لٹریچر بی اے تک کا پڑھنا بی اے کے لقب پانے کے لیے ناکافی ہے گورنمنٹ بھی ان کی قیمت ایک گریجوایٹ کی قائم نہیں کرتی بہت سے شعبے ملازمتوں کے ان سند یافتگان کے لیے گورنمنٹ کے قانون میں ویسے ہی ممنوع ہیں جیسا کہ ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل کے لیے ممنوع ہیں۔

علاوہ ازیں ڈھاکہ یونیورسٹی پر انگریزی داں اصحاب یہ جرح پیش کرتے ہیں کہ غالب تعلیم تو عربی کی ہوئی اور لقب انگریزی خواں کا دیا گیا یہ صحیح سند نہ ہوئی اور عربی داں

قدیم تعلیم یافتہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بی اے تک انگریزی لٹریچر پڑھانا فی الحقیقت علوم اسلامیہ کو ناقص رکھنا ہے۔ کام اگرچہ شروع ہو گیا لیکن اس طرح کی گفت و شنود نے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ گزشتہ سال ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار کا جو خط آیا تھا اس سے ذمہ داران یونیورسٹی کی یہ دقتیں معلوم ہوئیں۔

سرکاری سند کی ضرورت

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور ایام میں جب تک کسی کے ہاتھ میں ایسی سند نہیں جو مصدقہ گورنمنٹ ہو تو خواہ وہ سند کیسی ہی فضیلت سے مشحون کیوں نہ ہو حکومت اور علم برداران حکومت کی نگاہوں میں وقیع نہیں ہو سکتی اور اس ہو تعقی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خود سند یافتہ اپنے نفس میں کیفیت اعتماد نہ پائے گا جس کا اثر اس کے قوائے دماغیہ کی علمی بالیدگی کو پژمردہ کر دے گا اور تعلیم یافتہ دماغ کے لیے یہ ایک ایسا حادثہ ہو گا جس پر مجلس علمی سوگوار ہو گی۔

دوسرے یہ کہ مطالبات جسمانی کا انجام جب کہ پورا نہ ہو سکے گا تو لامحالہ شکستہ حالی پیدا ہو کر اسے نمونہ عبرت بنا دے گی اور یہ دونوں اسباب مل کر اس نوعیت تعلیم کو آخر کار فنا کر دیں گے اس دور ایام میں بی اے اور ایم اے کے لفظ میں جو اعتماد و اقتدار کہ رائج ہو گیا ہے وہ کسی لفظ میں بغیر اقتدار بخشی حکومت پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

انگریزی تعلیم کی ناگزیر ضرورت

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت و سلطنت کے ساتھ صرف درہم و دینار ہی کا خزانہ عطا نہیں ہوتا ہے بلکہ بہت سے کمالات و محاسن اس کے علاوہ ایسے عطا ہوتے ہیں جن کی پرستش و قدر دانی بعد از زوال سلطنت بھی باقی رہتی ہے۔ اس وقت کہ خطہ یورپ سریر آرائے سلطنت ہے وہاں کی زبانوں کا جاننا خالی از منفعت نہیں اس لیے بھی انگریزی تعلیم سے اعراض و چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

ڈھاکہ یونیورسٹی نے انہیں امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ندوۃ العلماء کے اصول

پر اپنا نصاب تعلیم مرتب کیا لیکن انگریزی تعلیم کو بڑھا کر بی اے تک پہنچا دیا اس اضافہ سے انگریزی لٹریچر کی وسعت تو ہو گئی لیکن اس سند یافتہ کی ملک، قوم، اور حکومت میں کیا قیمت ہوگی اس باب میں کسی خاص خصوصیت کا اظہار نہ ہو سکا۔

نظام تعلیم کے اس تغیر و تبدل سے اتنا تو ضرور معلوم ہوا کہ مسلمانان ہند کو اپنی وجاہت، اپنی معاشرت اور اپنے خوش منظر تمدن کے لیے انگریزی تعلیم سے مفر نہیں لیکن اپنی قومیت اپنی ملی خصوصیت اور اپنی مذہبی زندگی کی بقا کے لیے علوم اسلامیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ اب نہ تو صرف علوم اسلامیہ کی تعلیم انصرام حاجات اور ضروریات کے لیے کافی ہے نہ محض انگریزی کی سند یابی قومی درد کی دوا ہو سکتی ہے اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ جامع افراد کچھ تیار کیے جائیں اسی اجتماع کی تدبیر ابتداءً علماء ملت نے ایک قرار دی اُن کے بعد گروہ تعلیم یافتہ علوم مغربی کی کوشش کی نوبت آئی جس کا پہلا نمونہ ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔

میں اس وقت اس کا فیصلہ کرنا نہیں چاہتا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی پر جو اعتراض جدید وقدیم تعلیم یافتوں کا ہو رہا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے نہ میں اس کا فیصلہ کرنا چاہتا ہوں کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا نظام تعلیم صحیح ہے یا غلط لیکن اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ علم کو محض اُن بیش بہا فوائد کی غرض سے تحصیل کرنے والے جو مقاصد علم ہیں اس زمانہ میں نہ صرف کم یاب بلکہ نایاب ہیں لہٰذا ہمیں اپنی تعلیم گاہ میں اس کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیے کہ بعد فراغ سند یافتہ طلبہ کے لیے وہ تمام دروازے کشادہ رہیں جو عموماً ایک گریجوایٹ کے لیے کشادہ سمجھے گئے ہیں اگر اُن کی وسعت میں کمی آتی ہے تو اپنے نظام تعلیم کو فوراً بدل دینا چاہیے تاکہ قلوب عوام اس کی جانب مائل ہو سکیں۔

وظائف کی ضرورت ماہران فن تعلیم سے یہ امر مخفی نہیں کہ ایک مدت تک جو

علوم اسلامیہ اور علماء اسلام کو گوناگوں انواع سے ہیچ اور حقیر ثابت کیا گیا ہے اس نے مسلمانوں کو عربی کے نام سے دہشت زدہ بنا دیا ہے اس لئے محض علوم اسلامیہ کا انگریزی درس گاہوں میں شعبہ قائم کر دینا جذب قلوب کے لئے ہرگز ہرگز کافی نہ ہوگا۔

اس فقیر بے نوا کی گزارش کو ٹھکرایا نہ جائے امعان نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کو دلگیر دلپذیر بنانے کے لئے متعدد اور بار بار ذی رسوخ و ذی وجاہت ہستیاں مسلم یونیورسٹی کی تحریریں لکھیں اس کی اہمیت پر مستقل تقریریں کریں گورنمنٹ سے استدعا کریں کہ جامع افراد کی قیمت کچھ گراں قرار دے اسی کے ساتھ طلبہ کو وسیع وظیفہ دیا جائے معمولی ایم اے عربی کے لئے جب کہ وظائف کی ایک اچھی رقم دی جاتی ہے جس کی بدولت چند اشخاص عربی کے ایم اے میں دکھائی دیتے ہیں تو اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد بغیر وظائف کیوں کر استوار ہو سکیگی تقریر و تحریر سے دلوں میں تحریک پیدا کیجئے اور اچھی تعلیم اور وسیع وظیفے سے اس تحریک کو دلوں میں ثبات و قرار کی قوت عطا کیجئے گورنمنٹ سے یہ استدعا کرے کہ عربی ایم اے سے اسلامک اسٹڈیز کی سند بالاتر سمجھی جائے اس شعبہ کا رسوخ و احترام پیدا کیجئے۔

اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ سرکاری یونیورسٹیوں نے جو نصاب عربی ایم اے کا مقرر کیا ہے اور جیسی تعلیم عربی کی یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے اس نے اور بھی مسلمانوں کو بددل بنا رکھا ہے لیکن چونکہ ایم اے ہو جانے سے بعض ملازمتوں میں سہولت ہوتی ہے اس لئے کچھ اشخاص اس میں داخل ہو کر سند یابی کے لئے کوشاں رہتے ہیں طلبہ کا مقصد سند حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ عربی زبان سے آشنا ہونا میری یہ عرض داشت محتاج بیان و دلیل نہیں مسلم یونیورسٹی جس کی تعلیم عربی کا نصاب دیگر یونیورسٹیوں سے زیادہ مفید ہونا چاہئے تھا وہ سب سے زیادہ مضحکہ انگیز اور وحشت افزا ہے ایسی صورت میں علوم اسلامیہ کی طرف مسلمانوں کا میلان صرف اس شعبہ کے قائم کر دینے سے کیوں کر ہو جائے گا موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم ایک طرح کی تجارتی تعلیم ہے طالب العلم اپنے وقت اور روپیے کے عوض میں سند لینا چاہتا ہے قابلیت پیدا کرنا نہ یونیورسٹی

کے مقاصد میں ہی نہ طالب العلم کے ذہن میں اس کا خطرہ گذرتا ہی یہ وہ حقیقت واقعیہ ہی جس پر
بیشمار دلایل لائے جا سکتے ہیں لیکن قیل وقال کی نہ اپنی عادت نہ موقع و مصلحت اس کا مقتضی ہے ؎

گفتگو آئین درویشی نہ بود
ورنہ با تو ماجراہا داشتم ۱؎

الحاصل جامع افراد کی ضرورت مسلمانان ہند کے لئے کچھ ایسی ضرورت نہ تھی جسے ایک
گروہ ضروری قرار دیتا اور دوسرا اس کی ضرورت سے انکار کرتا یا اُسے وقتی یا مقامی کہہ کر
حیز التوا میں ڈال دیا جاتا نہیں بلکہ مرور ایام کے ساتھ اس کی ضرورت کی ہمہ گیری ایک گوشہ
ملک سے دوسرے گوشہ تک مسلم و محقق ہو گئی چنانچہ جب علی گڑھ کالج اپنے ارتقائی مراحل
طے کرتا ہوا یونیورسٹی کے مرتبہ پر پہنچا تو یہاں بھی منجملہ شعبہائے تعلیم ایک اسلامک اسٹڈیز
کا شعبہ قرار دیا گیا۔

مسلم یونیورسٹی اور اسلامک اسٹڈیز

اس فقیر بے بضاعت کے تمام سرمایہ کا خلاصہ یہ ہی کہ کچھ مدت
تک علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کرنے کی سعادت پائی ہے
اس کے سوا نہ کوئی کمال اپنے نفس میں ہی نہ کوئی سرمایہ مالی
اپنے ہاتھ میں، اس لئے اس فن کے ساتھ ایک خاص شغف اپنے دل میں پاتا ہوں چنانچہ فاؤنڈیشن
کمیٹی میں اس کا ذکر آتے ہی اس کے نظام تعلیم اور اجرائے درس کے لئے دل و دماغ میں ایک
حرکت پیدا ہو گئی کہ کالج ابھی یونیورسٹی کے مرتبہ کو پہنچا بھی نہ تھا مگر میں نے اس کی بنیاد رکھنی شروع
کردی اور دو گریجایٹوں کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ شعبہ منقول کی تکمیل صحیح استعداد کے ساتھ
کریں چنانچہ سید عبدالرؤف پاشا مدراسی اور سید احمد شاہ پشاوری اس کے لئے آمادہ ہو گئے
اور کام شروع ہو گیا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عین موقع پر ایک طوفان عظیم
نان کوآپریشن کا آیا جس میں ساری محنت نذر سیلاب ہو گئی۔
اب مسلم یونیورسٹی قائم ہو گئی اور نان کوآپریشن کا زلزلہ اس تعلیم گاہ میں مائل بسکون ہونے لگا

۱؎ (حافظ شیرازی) [illegible]

اس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے جنھیں اس شعبے سے دلی ہمدردی ہی اور اس کے اجراء اور استحکام کے لئے جن کی تمنا حدِ اضطرار[1] تک پہنچ گئی ہے علوم اسلامیہ کی آنریری چیئر فقیر سے متعلق فرمائی میں نے دوبارہ کوشش کی اور دوایم اے طالب العلم حافظ ظہیر الحسن اور محمد شفیع اس کام کے لئے آمادہ ہوگئے کام شروع کر دیا گیا اور تین مہینے تک مسلسل جاری رہا جس کا معائنہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی نے بہ حیثیت ممبر اسلامک اسٹڈیز و ممبر کورٹ فرمایا تھا درس میں تشریف لائے ایک گھنٹہ سے زیادہ شریک رہے طریقۂ تعلیم اور استعداد و مطالعۂ متعلمین کو بغور ملاحظہ فرمایا بعض سوالات بھی اُٹھائے درس میں طلبہ پر پیش فرمائے اور جواب سُن کر خوش ہوئے لیکن اسے یونیورسٹی کی خوش نصیبی کہئے یا بدنصیبی کہ خود ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کی ذات یونیورسٹی میں مختلف طبائع کی بانواع گوناگوں[2] جولان گاہ[3] بن گئی اس کشاکش و طوائف الملوکی[4] میں اس کی فرصت کہاں تھی جو اس کے مراتب و منازل کو مستحکم و استوار کیا جاتا علاوہ ازیں بعض ایسے بے اصول متعصبانہ امور اس شعبے کے حق میں وقوع پذیر ہوئے جس سے علوم اسلامیہ کی سخت توہین و تنقیص ہوتی تھی اس نے میری ہمت کو پست کر دیا اور اس طرح دوسری کوشش بھی افسردگی کا اضافہ کرتے ہوئے پامال ہوگئی۔

مجوزہ تین شعبے میری رائے میں اسلامک اسٹڈیز کے تین شعبوں کا قیام بالفعل ضروری تھا جن میں سے ایک ایسے شعبے کو جسے قومی حیثیت سے زیادہ اہمیت تھی اور اس میں کشش کی قوت بھی زیادہ تھی میں جاری کرنا چاہتا تھا بعد تجربہ ہر سہ شعبہ ہائے اسلامک اسٹڈیز کے متعلق کامل اسکیم پیش کر دی جاتی اور اس ثبوت میں کہ اسلامک اسٹڈیز قوم کے لئے کیسی ضروری اور منفعت رساں ہے فارغ التحصیل طلبہ کا وجود عملی اور ناطق[5] شاہد ہوتا لیکن میرا یہ خیال جب کہ تعصب اور اندرونی پولیٹکس کا شکار ہو گیا تو پھر اس وقت ایک دوسری راہ اختیار کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم سے پہلے تاسیس کے متعلق ایک مفصل رپورٹ تیار کر دی جائے

[1] اضطرار — بے اختیاری، بے قراری، ناچاری، لاچاری (۲) [illegible] (۳) [illegible] [2] گوناگوں — رنگ برنگ کا۔

اور اسے چھپوا کر ممبران کورٹ اور دیگر اہل علم کی خدمتوں میں بغرض تنقید و تبصرہ بھیجا جائے تاکہ مسلم یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کا معیار اور نصاب تعلیم کثرت آرا سے جو طے پا جائیگا وہ آئندہ اندرونی پولیٹکس و اغراض کا دست مال نہ ہو سکے گا۔ نیز اس شعبہ کا آوازہ ملک اور قوم میں بلند ہو جائے گا۔

دوسرا فائدہ اس رپورٹ سے یہ سمجھا گیا تھا کہ علاوہ شہرت و اعلان کے تعلیم یافتہ گروہ کو اس کی خبر ہو جائے گی کہ اسلامک اسٹڈیز کا معیار اور طریقہ تعلیم مسلم یونیورسٹی میں وہ نہیں ہے جو لفظ یونیورسٹی سن کر توقع کیا جاتا ہے بلکہ اس کا معیار بہت بلند اور اس کی تعلیم بہت صحیح اصول پر جاری ہو رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طالب العلم جہاں بی اے کی سند رکھ کر علماء علوم مغربی کے ہمراہ ہوگا تو اسلامک اسٹڈیز کی سند سے اُسے علماء مشرق کے پہلو بہ پہلو جگہ عطا کی جائیگی اس شہرت و اعتماد سے اس کی توقع تھی کہ مسلمانوں کا رجحان اس طرف ہو جاتا وظائف کے تئے روپیہ کے ملنے میں سہولت ہوتی اور طالب علم اس میں داخل ہو کر توجہ سے پڑھتا۔

مشاہیر عالم نے کسی کام کے آغاز کرنے سے پہلے چند امور کی تنقیح ضروری سمجھی ہے اولاً یہ کہ اس کام کی غایت اور اس کا مقصد بہت سوچ سمجھ کر متعین و مقرر کیا جائے۔ ثانیاً تعین مقصد کے بعد کامیابی کی راہیں امعان نظر سے مطالعہ کی جائیں ثالثاً اُن مشکلات پر بھی غور کر لیا جائے جو ان مراحل کے طے کرنے اور مقصد تک پہونچنے میں پیش آئیں گی رابعاً ان تدابیر پر صحیح اصول سے غور کیا جائے جن کی وساطت سے مشکلات کا حل ہوگا خامساً کامیابی اور حصول مقصد کے لئے ایثار کی نوعیت اور مقدار بھی پہلے سمجھ لی جائے اس لئے کہ آج تک کوئی کام بغیر ایثار کے نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہو۔

اُن کا دعویٰ ہے کہ کامیابی کا راز انھیں امور خمسہ میں مضمر ہے اگر آغاز کار سے پہلے یہ امور اچھی طرح غور کر لئے جائیں تو نہ منزل کھوٹی ہو نہ رجعت کا اندیشہ رہتا ہے لیکن اگر ان میں کمی رہ گئی ہے تو پھر اسی کمی کی مناسبت سے اس مقصد کے حصول

دست مال۔ ہاتھ پونچھنے کا رومال، [illegible] تنقیح [illegible] کسی چیز کو رد و کد اور عیوب سے پاک

میں ناکامی و محرومی رہے گی۔

ایک اہم تعین کی ضرورت اگر مشاہیر عالم کی یہ رائے صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو مسلم یونیورسٹی کو سب سے پہلے یہ تعین کرنا چاہئے کہ علوم اسلامیہ کے ثمرات کس ترتیب تک کے حاصل کرنا اس کا مقصد ہی ادنیٰ یا اوسط یا اعلیٰ نیز یہ کہ قوم کی بے دلی اور بے توجہی کا کیا انتظام ہوگا مصارف کی جب ضرورت آئے گی تو روپیہ کس مد سے دیا جائیگا علوم اسلامیہ کے بہت سے شعبے ہیں ان میں کتنے شعبوں کی تعلیم شروع کی جائے گی غرض اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جنھیں تعمق نظر سے دیکھ کر مستحکم فیصلہ کرنا ہی ہر شتماہی میں رد و بدل تعلیم سے ناآشنائی یا بے پروائی کا اظہار کرتی ہے۔

میری رپورٹ میری اس مفصل رپورٹ سے بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں لیکن خیالات کے اختلاف نے مجھے اس کی تیاری سے روک دیا اور اب میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری اس رپورٹ کا کیا موضوع ہوتا اور اس کی تیاری کس قدر ضروری و اہم تھی رپورٹ کے تین حصے کئے گئے تھے۔

۱۔ عربی زبان کے محاسن و فضائل

پہلا حصہ اس کا تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کا ہوتا جس میں عربی زبان کے محاسن و فضائل پر ایک گونہ بسیط بحث کی جاتی اور مختلف پہلوؤں سے اس زبان کی وسعت و انکشاف حقیقت پر تبصرہ کیا جاتا اس حصے سے تین فوائد کا مترتب ہونا میرے خیال میں تھا اولاً یہ کہ جب مسلمان اس کامل ترین اور جامع ترین زبان کے خط و خال اس وضاحت کے ساتھ مشاہدہ کریں گے تو ایسے آراستہ و پیراستہ گراں بہا سرمایہ کے اتلاف پر انہیں بھی تاسف ہوگا اور ہزار میں سے دو ایک تو اس کی تحصیل کی طرف مائل و راغب ہو ہی جائیں گے ادبی اور لسانی حیثیت سے عربی کے حسن و جمال کی گویا یہ ایک نمائش ہوتی۔

دوسرا فائدہ اس سے یہ خیال میں تھا کہ عربی فن ادب کی تعلیم جس بے رحمی سے ذبح

کی جارہی ہے اس حصہ کے مطالعہ سے متعلم اور معلم شاید رحم کی طرف مائل ہوجائیں اور فن ادب کا درس ادیبانہ انداز پر شروع ہوجائے انگریزی یونیورسٹیوں میں عربی علوم کا جو شعبہ زیر درس ہے وہ صرف فن ادب ہے وہاں کی تعلیم عربی سے آشنا بناتی ہے یا بیگانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے یہ ایک کھلا راز ہے کچھ تعجب نہ تھا اگر یہ مشورہ علمیہ دیگر یونیورسٹیوں میں بھی مقبول ہوتا اور اس سے انگریزی درس گاہوں کی عربی تعلیم سلجھ جاتی۔

تیسرا فائدہ اس سے یہ سمجھا گیا تھا کہ اسے نمونہ قرار دے کر طالب العلم فن ادب کے متعلق کچھ تحقیقات کرسکے گا اس وقت تک ہندوستان کی کسی یونیورسٹی نے عربی علم ادب کے متعلق نہ تو کسی محققانہ مضمون کی اشاعت کی ہے نہ عربی تعلیم کے متعلق کوئی خاص عالمانہ مضمون لکھا ہے مسلم یونیورسٹی میں یورپین پروفیسر کا تعلق اٹھارہ برس سے مسلسل چلا آرہا ہے گر یہاں کے دفتر علمیہ میں کوئی تلاش کرے کہ اعلیٰ مدرسین کے اس دیرپا قیام سے کیا فیض خاص علم عربی یا طریقہ تعلیم عربی کو حاصل ہوا تو اس کی تلاش عبث ہوگی اور یہاں سے جواب میں نفی کا کلمہ کہا جائے گا۔

اس حصہ کا تکملہ مجھ جیسے بے بضاعت اور کمزور دل و دماغ کے شخص کے حوصلہ کا نہ تھا لیکن متوکلاً علی اللہ اس پر آمادہ ہوا اور فروری کے اول ہفتہ میں نصف سے زیادہ اس کا حصہ مکمل ہوگیا پروفیسر انعام اللہ خاں صاحب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مولانا عبدالحق صاحب حقی کے سامنے موجودہ کوشش بغرض مشورہ و اصلاح پیش کی گئی اور ان علم دوست حضرات نے فقیر کی اس حقیر کوشش کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا اور عربی علم ادب کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے اسے مفید و منفعت رساں قرار دیا۔

۲۔ علوم اسلامیہ کی تفصیل

دوسرا حصہ رپورٹ کا یہ ہونا چاہئے جس میں اسلامک اسٹڈیز یعنی علوم اسلامیہ کی

تفصیل کافی شرح وبسط کے ساتھ ہو ادب منقول اور معقول، اس کی مفصل فہرست اس طرح دی جائے کہ پہلے فن اور اس کا موضوع لکھا جائے پھر یہ بتایا جائے کہ اس فن میں قابل درس کون سی کتاب ہو اور کونسی کتاب وسعت نظر کے لئے قابل مطالعہ ہے اس کی دو حصے ہونگے پہلے میں اُن علوم کا بیان ہوگا جن کی بنیاد و تعمیر محض اسلام کے طفیل اس عالم میں پائی گئی اور ان علوم سے زبان عربی کی کہاں تک محافظت ہوئی اس کا ذکر ہوگا نیز یہ کہ ان علوم سے جذبات نفسانیہ اور قوائے دماغیہ کی تہذیب و ترتیب کس حد تک کی تہذیب اخلاق تدبیر منزل اور سیاست مدن[1] پر ان کا کیا اثر ہوا انفرادی زندگی سے ایک حیات شاہنشاہی تک اُن کی رہنمائی کہاں تک شمع راہ ہوسکی پھر یہ کہ موجودہ دور ایام میں ان کی تحصیل و تعلیم سے کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہو۔

مثلاً قرآن وحدیث اور فقہ یہ ایسے علوم ہیں جن کی برکات سے دنیا اس وقت تک محروم رہی جب تک اسلام کی رحمت اس خاکدان عالم پر ضیا افگن نہ ہوئی۔

کہنے کے لئے حدیث تفسیر اور فقہ تین الفاظ ہیں جو نہایت سہولت سے ادا ہو جاتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ایک مستقل فن ہو اور ان میں ہر فن کا کمال چند لوازم کی تحصیل پر موقوف ہے جس کی تفصیل اس مقام پر نہیں کی جاسکتی یہاں تو صرف اس قدر کہنا ہو کہ ان علوم کی نسبت جو اسلام کی طرف کی جاتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہو کہ ان علمی برکات کا دنیا اس وقت تک انتظار کرتی رہی جب تک مقدس اسلام کا تحفۂ رحمت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ ہاتھوں سے دنیا کو نہ ملا۔

۳۔ دانہ خرمن غنچہ گلشن

اس کے بعد اس کا دوسرا حصّہ بیان کیا جائے جس میں اسی تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جائے کہ وہ کونسے علوم ہیں جن کا وجود اگرچہ اسلام سے پہلے دنیا میں موجود تھا لیکن انہیں علوم کی سرپرستی جب مسلمانوں نے کی ہو تو اُن کے ذوق علمی کی آبیاری نے دانہ کو خرمن اور غنچہ کو گلشن بنا دیا۔

[1] [illegible]

منطق طبیعیات عنصریات فلکیات الٰہیات اور ریاضی کے جملہ شعبے اس ذیل میں داخل ہو جاتے ہیں یہ مسلمانوں پر افترا ہے کہ فلسفہ اور منطق میں فلاطون اور ارسطو کے اقوال تھے جو مسلمانوں کے منہ سے صدائے بازگشت ہو کر نکلے اور علم ہیئت میں یہ صرف بطلیموس کی لکیر پیٹا کئے اہل تحقیق اور صاحب فن جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے یونانیوں سے اس فن کو لیا اور اپنی تحقیقات میں گراں بہا اور گراں مایہ سرمایہ انھوں نے تیار کیا کہ یونانیوں کی حکمت ان کی تحقیقات میں اس طرح گم ہو گئی جس طرح اصل جوہر اعضا جسم میں گم ہیں۔ اس شعبے میں مسلمانوں کی ذہنی تگ و تاز اہل بصیرت کے لئے ایک ایسا تماشا گاہ ہے جس کے مطالعہ سے عالمانہ دماغ کبھی سیر نہیں ہوتا۔

(علم کلام)

حکمار یونان کے مقابلہ میں علمار اسلام نے ایک ایسا خاص فن ایجاد کیا جسے علم کلام کا لقب ہے اس فن نے مسلمانوں کو یونانیوں کے فلسفہ سے ہر طرح بے نیاز کر دیا اس فن میں اسلام کے اعتقادی امور جو قرآن و حدیث سے قابل وثوق اور طمانیت بخش دلائل سے ثابت ہوتے ہیں ان کا ذکر کیا جاتا ہے دوسری اور تیسری صدی تک اس فن کے مسائل فقط قرآن و حدیث سے ثابت کئے جاتے تھے عہد نبوت کا قرب تھا اس لئے مسلمانوں کے ذہن میں راستی و صفائی پائی جاتی تھی صداقت پسندی اور خدا ترسی مسلمانوں کا شعار و دثار[1] تھا ایسی حالت میں علمار ربانی جب کسی اعتقادی مسئلہ کو اصول دین کے قواعد سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش فرماتے تو اسے مسلمانوں کے حلقہ میں مقبولیت عام حاصل ہوتی۔ لیکن جب زمانہ کے بُعد نے برکاتِ نبوت سے مسلمانوں کو دور کر دیا تو پھر ان کی وہ ذہنی کیفیت باقی نہ رہی اس لئے چوتھی اور پانچویں صدی میں ان مسائل کا بیان حکیمانہ اور فلسفیانہ قالب میں ڈھل گیا جسے مابعد کے متکلمین نے ایک ایسا فن مستقل بنا دیا کہ فلسفی علوم کے مقابلہ میں علم کلام کی مسند آراستہ کی گئی۔

فن کلام چند ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے ایک ان میں سے امور عامہ ہیں جس میں موجودات

---

[1] دثار۔ وہ کپڑا جو دوسرے کپڑے کے اوپر پہنا جاتا ہے۔ جسم کے ساتھ پہنے والے کپڑے کو شعار کہتے ہیں۔

وہ حالات مشترکہ جو اُن کی ہستی اور اُس کے متعلق امور سے علاقہ رکھتے ہیں بیان کئے جاتے ہیں اس باب میں موجود کی حقیقت سے بحث کی جاتی ہے اور ماہیتوں کے خارج میں ہونے اور نہ ہونے کا بیان ہوتا ہے مثلاً سطح مستوی اور دائرہ خارج میں موجود ہے یا نہیں اقلیدس میں اُن کے عوارض ذاتیہ سے بحث ہوتی ہے لیکن اُن کی ماہیتوں کے وجود خارجی اور ذہنی سے بحث اور اُن کے ماہیاتؔ[1] کا تحقق[2] امور عامہ کا حصّہ ہے۔

دوسرا باب جواہر کے ابحاث میں ہوتا ہے تمام اجسام خواہ فلکی ہوں یا عنصری اُن کے حالات اور ترتیب نیز نفس و روح کا بیان اس باب میں بیان ہوتا ہے۔

تیسرے باب میں اعراض کے اقسام اور اُن کے اجمالی حالات مذکور ہوتے ہیں۔

باب چہارم میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور انسان کے اختیاری اعمال کی خوبی و زشتی[3] کا اور ثواب وعذاب کی[4] استحقاق کا بیان ہے۔

باب پنجم میں نبوت اور اس کے متعلقات کی بحث ہوتی ہے۔

ششم میں وہ تمام امور جو قرآن و حدیث سے ملتی اور ظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتے ہیں ان امور کی تحقیق اور مادیتؔ[5] کے شبہات کا جواب ہوتا ہے یہ فن خاص مسلمانوں کا ہے اور اس کا جاننے والا علوم فلسفہ سے بے نیاز ہے۔

(تصوّف)

اسی ذیل میں فن تصوف کا بھی نام آتا ہے اگرچہ اس کا ایک حصّہ مسخ شدہ صورت میں ہندوستان اور ملک شام کے قرب وجوار میں موجود تھا لیکن نہ اس سے روحانی فائدہ حاصل تھا نہ اخلاقی نہ دینی ثمرہ اس سے مترتب تھا نہ دنیاوی ہاں جس وقت مسلمانوں نے علمی وعملی حیثیت سے اصول دین اور ہدایت اسلام کی تلقین پر اس فن کی ترتیب و تنظیم دی ہے تو پھر یہ علم دنیا اور اہل دنیا کے لئے سعادت عظمیٰ اور برکت کبریٰ ہو گیا۔

فن تصوف کے دو شعبے ہیں ایک علم معاملہ ہے اور دوسرا علم مکاشفہ شریعت اسلام

---

۱ ماہیات۔ (ماہیت کی جمع) کیفیت، حقیقت، اصلیت (۲) اصل ... ۲ تحقق ... ثابت ہونا، موجود ہونا، درست ہونا
۳ زشتی ... [illegible]

کے اس منشا کی تکمیل علم معاملہ سے ہوتی ہے کہ انسان اپنے نفس میں ایسی حالت پیدا کرلے کہ اگر افعال ناشائستہ کا اُس سے صدور ہو یا اعمال حسنہ کی تعمیل میں اُس سے قصور ہو تو اُس میں ایک ایسا خیالی آزار پیدا ہو جیسا کہ اُسے جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کی وقت محسوس ہوتا ہے جس طرح ذی عزت و وجاہت اور خود دار آدمی کو گداگری اور دریوزہ گری میں مبتلا ہونے سے ایک سخت ایذا و تکلیف ہوتی ہے اسی طرح اس ملکہ کے بعد اس شخص کو ہر ناکردنی کے نہ صرف ارتکاب بلکہ عمل کے خیال پر روحانی تکلیف ہو۔

دوسرا شعبہ تصوف کا علم مکاشفہ ہے وہ خاص خاص اعمال کے ذریعے سے نفس کو مشقت میں ڈال کر مطالبات حیوانی سے بقدر ضرورت تعلق رکھنا اور قوائے روحانی میں ملکوتی قابلیت کا پیدا کرنا ہے تاکہ اسرار شریعت کا وہ حال داعی ہوسکے اور ہر اعمال صالحہ کا نورانی اثر اس کی روح کو مجلیٰ و مصفیٰ بنائے۔

اس علم کے حقیقی وارث جب کبھی اس چودہ[۱۴۰۰] سو برس کے عرصے میں دنیا کے کسی حصہ میں پائے گئے تو وہ خلق کے لئے ملک کے لئے قوم و ملت کے لئے ایک خاص رحمت الٰہی سمجھے گئے ان برگزیدہ ہستیوں نے اخلاق حسنہ اور عادات حمیدہ سے اپنے ہم نشینوں کو مالا مال کر دیا اشاعت اسلام اور ترویج مذہب اور تعلیم اخلاق میں اس گروہ کا بہت بڑا حصہ ہے خلاصہ یہ کہ فن کلام نے حکماء مشائین[۱] کے فلسفہ سے مسلمانوں کو بے نیاز کیا تھا تو علم تصوف نے حکماء اشراقیین[۲] کی حکمت کو بے نور ثابت کر دیا۔

(تاریخ و جغرافیہ)

فن جغرافیہ اور تاریخ بھی اسلام سے قبل دنیا میں موجود تھا علم ہیئت کے ذیل میں ایک مختصر باب جغرافیہ کا ضرور ہوتا تھا زمین کے حصوں کے وہ حالات اس میں مختصراً بیان کئے جاتے تھے جو آفتاب کے قرب و بعد اور اس کی شعاع کے مختلف طور سے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس بیان سے علم ہیئت کی کوئی کتاب خالی نہیں ہوتی تشریح الافلا

---

[۱] مشائین۔ اس عقیدے کے پیرو حکیم جس میں حقایق اشیاء دلیل سے معلوم کی جاتیں اور وہ ایک دوسرے کے پاس جا کر علم حاصل کیا کرتے تھے۔ بخلاف اشراقیین۔ [۲] اشراقیین۔ حکماء کا وہ ریاضت کرنے والا علم و ہنر یا تصوف میں مشقت اٹھانے والا گروہ، جو تصفیہ قلب [illegible]
کشف کے [illegible]

اور شرح چغمنی جیسے مختصرات میں بھی اس کا بیان موجود ہے لیکن مسلمانوں نے اس فن میں جو ترقی کی ہے اور آج ان کی تحقیقات کا بیکراں سرمایہ جو ضخیم مجلدات میں موجود ہے اُسے دیکھ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بطلیموس کا جغرافیہ ایک قطرہ تھا جسے اپنی تحقیقات اور اضافات سے مسلمانوں نے ایک دریا بنا دیا۔

تیسری صدی ہجری میں عرب کا کامل جغرافیہ تیار تھا ایک ایک گاؤں کی تفصیل اور ہر گاؤں کی پیداوار اور عمارتوں معدنیات اشجار نبات جانور اور تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے مذکور کئے گئے تھے ابن الحائیک ہمدانی نے عرب کا یہ جغرافیہ تیار کیا تھا اس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اسے ہیئت کا ایک مختصر جزو نہ رکھا بلکہ اسے ایک مستقل مرتبہ علم وفن کا عطا کر دیا یاقوت حموی کے معجم البلدان اور مشترک ابن حوقل بغدادی کا جغرافیہ اور دیگر مصنفین کی ضخیم مجلدات اس فن میں مسلمانوں کے مجتہدانہ کمال پر شاہد عدل ہیں۔

تاریخ کا فن بھی مسلمانوں کی تحقیقات کا ویسا ہی زیر بار احسان ہے جیسا کہ فن جغرافیہ اُن کی سپاس گزاری میں رطب اللسان ہے اس فن میں مسلمانوں کی تصنیف کی کوئی انتہا نہیں ہے ہر صدی کی تاریخ جداگانہ بھی ہے اور تمام قرون کی ایک جا بھی ہے کسی نے کسی خاص ملک یا شہر کے حالات کی گرہ کشائی کی کسی نے کسی خاص واقعہ میں اپنی تحقیقات کا کمال ثابت کیا کسی نے سفر نامہ لکھا اور کسی نے کسی کی سیرت لکھی پھر واقعات کے لکھنے میں ایسی کدو کاوش کی ہے کہ علم منقول کو معقول ومحسوس کے مرتبہ تک پہنچا دیا اگر جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں کا کل سرمایہ جمع کر لیا جائے تو صرف انھیں دونوں کی مجلدات سے ایک کتب خانہ بن جائے۔

(طب)

یونانیوں کا ایک فن علم طب بھی تھا موجد اس فن کا اسقلیبس ہے اس حکیم نے اس فن کی

نہ تو تردین کی نہ اپنے خاندان سے اس فن کو باہر جانے دیا پندرہ نسلوں تک یہ علم سینہ بسینہ باپ سے بیٹے کو پہنچتا رہا اب بقراط پیدا ہوا جس کی ولادت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پانسو برس قبل ہے اس نے اس فن کو قلم بند کیا اور سلسلۂ تعلیم کو ایک حد تک عام کر دیا۔

آخری حکیم یونانیوں کا جالینوس ہی اس فن میں اسقلیبس سے لے کر جالینوس کل آٹھ حکیم ایسے گزرے ہیں جن کا مرتبہ رکن کا تسلیم کیا گیا ہے جالینوس ۵۹ء میں جب پیدا ہوا اور سترہ برس کی عمر میں علم ہندسہ و حساب سے فارغ ہو کر فن طب کی تحصیل شروع کی تو اس نے اپنے عہد میں تعلیم کے دائرہ کو بہت اچھی وسعت دی اور کتابیں بھی تصنیف کے طرز پر بہت سی لکھیں اس کے بعد فن طب نے یونانیوں میں کوئی ترقی نہیں پائی لیکن جب مسلمانوں نے اس فن کو ترجمے کے ذریعے سے عربی میں منتقل کیا ہے اور پھر اس فن کی طرف محققانہ انداز سے متوجہ ہوئے تو اسے بھی اسی کمال پر پہنچا دیا جو مرتبہ یونانیوں کے دیگر علوم کو مسلمانوں نے عطا کیا تھا۔

دوسرے حصہ کی اہمیت الحاصل رپورٹ کا دوسرا حصہ میں نے علوم کے بیان و تفصیل کے لئے مقرر کیا تھا اس سے دو فائدے مطلوب تھے ایک تو یہ کہ آج جو مسلمانان عالم من حیث القوم اپنی علمی پستی محسوس کر رہے ہیں اس کا سبب خود ان کی تن آسانی اور پست ہمتی ہے اسلاف نے ان کے لئے گراں مایہ علمی ذخیرہ چھوڑا ہے یہ اس پر اضافہ تو کیا کرتے آج اس سے بھی بے خبر ہیں کہ عہد سلف کے کیا کارنامے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہ کیجئے کہ جب مسلمانوں میں حکومت و سلطنت تھی تو باوجود ان تمام دشواریوں کے جو تحصیل علم اور اشاعت علم کے لئے ہر قدم پر سنگ راہ تھے مسلمانوں کی بلند حوصلگی ان سب پر غالب آئی اور گوناگوں علوم انھوں نے اس طرح حاصل کئے کہ اپنے تحقیقات اور اضافات سے اغیار کے سرمایہ کو بھی اپنی ملکیت بنا لیا آج یورپ نے مادی ایجادوں کی وساطت سے جب کہ برسوں کے کام کو گھنٹوں میں انجام دینے کا طریقہ اور راستہ پا لیا اور وہ تمام خزانہ معلومات کا جو

مسلمانوں کا اندوختہ[1] تھا مع سلطنت وحکومت کے اُن کے ہاتھوں میں آگیا تو پھر جو کچھ وہ کر رہے ہیں یہ کوئی حیرت انگیز مثال نہیں۔ حیرت تو مسلمانوں پہ ہے جنھوں نے دائرۂ مذہب میں رہ کر اسلام کے اعمال وارکان کو غایت شغف کے ساتھ تعمیل کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے تو اپنے الہامی اور مذہبی علوم کا دریا بہا دیا اور دوسرے ہاتھ سے انسانی اور وضعی علوم کو بحر ناپید اکنار کے مرتبہ تک پہنچا دیا آج اُن کی محنت اور دماغی قابلیت کا اگر اقرار نہ کیا جائے تو کم از کم اُن کے کمالات پر خاک ڈالنے سے تو ہاتھوں کو بچا لیا جائے سہ

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار[2]

ان باتوں کو رپورٹ کے دوسرے حصّہ میں تفصیل کے ساتھ پیش کرنے سے میرا مقصد مسلمانوں میں اس کا شوق پیدا کرنا تھا کہ وہ علوم اسلامیہ کی طرف صحیح رجحان کے ساتھ متوجہ ہوں اور اسے ہیچ سمجھ کر اعراض و وحشت نہ کریں یہ بیان اس حیثیت سے بھی اپنی تفصیل و توضیح کا طالب ہے کہ مسلم قوم کے دل و دماغ میں وہ مغالطہ آمیز اعذار و صداقت سے بعید اعتراضات جن کا ذکر ابھی ابھی صفحات ماقبل پر کیا گیا ہے ہنوز نقش کالحجر ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں جب کہ مسلمانوں کی اولاد علوم اسلامیہ کو اسی وحشت اور حقارت کی نظروں سے دیکھے گی تو معلمین و اساتذہ درس کس کو دیں گے یا کوئی جامعہ اس شعبہ کو قائم کس کے لئے رکھیگا۔

یا بعد افتتاح طلبہ مائل تو ہوں لیکن طالبانہ حیثیت سے متوجہ نہ ہوں بلکہ اس شعبے کو عربی و فارسی کے ایم اے پر قیاس کرتے ہوئے محض سند یابی کے لئے اسی بے توجہی اور خامی استعداد کے ساتھ پڑھنا چاہیں جس نوعیت تعلیم کا انھیں کالجوں اور یونیورسٹیوں نے خوگر[3] بنا رکھا ہے تو ایسی تعلیم افاضۂ[4] علمیہ کے بجائے جہل مرکب کے رسوخ کا موجب ہوگی اور اس ظلم دوستی و ظلم پروری پر شاعر کا یہ شعر صادق آئے گا سہ

جاں بخشد از کشتہ را دانگہ بخوں فرماں دہد
خوں خواری آں شوخ بیں کز بہر کشتن جاں دہد[5]

---

[1] اندوختہ۔ جمع کیا ہوا، روپیہ پیسا، پس انداز، بچا ہوا [2] (سعدی شیرازی) گزرے ہوؤں کی نیک نامی کو ضائع مت کر تا کہ تمہاری نیک نامی بھی برقرار رہے۔ [3] خوگر۔ عادی، جس کو کسی بات کی عادت پڑی ہوئی ہو۔ [4] افاضہ۔ فیض، فیض رسانی (۲) خبر پہنچانا، بہت ... بات شروع کرنا [5] وہ مقتول کو اپنے ہونٹوں سے نئی زندگی دیتا ہے۔ اور پھر اس شوخ کی خونخواری کو دیکھو کہ قتل کرنے کے لیے اپنے دم ... سے زندہ کرتا ہے۔

اسی ضمن میں اس حصہ رپورٹ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا کہ ہر درس گاہ اپنی تعلیم کا جو مقصد قرار دے گی اس مقصد کے موافق انتخاب علوم اور نصاب تعلیم کے تعین و تقرر میں بصیرت و خبرت[1] کے ساتھ سہولت پیدا ہو جائے گی اور یہ احسان تعلیم گاہوں پر مسلم یونیورسٹی کا ہوگا خود مسلم یونیورسٹی کو بھی اس کا موقع ملتا کہ وہ بھی اپنے لئے علوم مفیدہ اور استعداد پیدا کرنے والی کتابوں کا نصاب کے لئے انتخاب اعتماد اور وثوق کے ساتھ کرتی کسی پروفیسر کے کہے یا لکھے ہوئے کی تقلید جامد بے سوچے سمجھے نہ کی جاتی علمار فن کی اگرچہ رہنمائی ہوتی لیکن رہ[2] نوردی تحقیق کے پاؤں سے کی جاتی۔

تیسرے حصّہ کی اہمیت رپورٹ کے تیسرے حصّہ میں اس مسئلہ سے بحث کی جاتی کہ نظام تعلیم عربیہ میں کیا ایسا فساد پیدا ہو گیا جس نے جودت استعداد اور صحیح قابلیت میں گھن لگا دیا ہر دور لاحق اپنے سابق سے اتنا فروتر ہوتا چلا گیا کہ اس وقت اعلیٰ مدارس کسی جید عالم کے لئے جو رئیس مدرسہ اور صدر مدرس بننے کی قابلیت رکھتا ہو چشم براہ ہیں لیکن مطلوب کی شکل تو کجا کہیں اس کا سایہ بھی نظر نہیں آتا یہ بحث نہایت ہی اہم ہے اور اس کا تکملہ و تتمہ بہت ہی جاں کاہی اور دماغ پاشی کا خواہاں ہے ہر دور کے علوم اور ان کے طریقۂ تعلیم اور معلمین کی قابلیت و استعداد کا بیان جب تک نہ کیا جائے گا یہ حصّہ تشنہ رہے گا۔ اس تیسرے حصّہ رپورٹ سے علاوہ علمی فوائد ایک یہ فائدہ خیال کیا گیا تھا کہ مسلم یونیورسٹی میں جب علوم اسلامیہ کا درس آغاز ہو تو یہاں کی تعلیم حتی الامکان ان کمزوریوں اور خرابیوں سے پاک وصاف رہے جن کے سموم اثر نے صحیح قابلیت و استعداد کو بے تیغ شہید کر دیا صحت تعلیم کے لئے تہذیب و ترتیب نصاب کی چنداں حاجت نہیں جس قدر کہ طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی حاجت ہے۔

میری رائے میں جب تک ان امور سہ گانہ کو تفصیل اور امعان نظر کے ساتھ اساتذۂ علوم مغربیہ مطالعہ نہ کریں گے نہ عمدہ نصاب علوم اسلامیہ کا ترتیب دے سکیں گے نہ علوم و

فنون مقیدہ کا صحیح اور نافع انتخاب کر سکیں گے نہ قابل تعلیم اساتذہ کی خدمت انھیں مل سکیگی۔
حامیان مسلم یونیورسٹی کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ علوم مشرقیہ کے جاننے والے علمائِ
ہند جب ایک جگہ مجتمع ہو کر اصلاح تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو چند سال میں اپنی صحیح
فکر کا منفعت رساں نتیجہ انھوں نے پیش کر دیا مثلاً ندوۃ العلماء نے اپنی تعلیم گاہ کا یہ مقصد قرار
دیا تھا کہ یہاں کا فارغ التحصیل طالب العلم اگر انگریزی تعلیم کا بموجب قوانین یونیورسٹی تکملہ کرنا چاہے
تو پانچ برس میں گریجوایٹ ہو جائے اور اگر اپنی موجودہ انگریزی دانی کو قوت مطالعہ سے بڑھانا
چاہے تو کچھ عرصہ میں اس کی استعداد ایسی ہو جائے کہ اپنا مدعا انگریزی کتابوں کو پڑھ کر
حاصل کر لے۔

چنانچہ پہلا دور جو ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل طلبہ کا دار العلوم سے نکلا اس کے
سند یافتہ طلباء دونوں راستوں پر چل کر کامیاب ہوئے بی اے ایم اے بھی ہوئے
اور اپنے مطالعہ سے برکلے اور ہکسلے کے فلسفہ کو سمجھ کر ملک و قوم کے سامنے پیش کرنے
والے بھی پائے گئے۔ اس عمل سے علماء کی اصابت رائے اور صحت تجویز
پر مہر ہو گئی۔

لیکن اس وقت تک یونیورسٹیوں نے یہ ثابت نہ کیا کہ علوم مشرقیہ کا ایسا درس
لذت بخش طلباء انگریزی خواں کو کالجوں میں دیا گیا کہ انھوں نے بعد فراغ تعلیم انگریزی
علوم مشرقیہ کی ایسی تکمیل کی ہو جو علماء کے نزدیک اپنے اعتبار کا وہی مرتبہ رکھتی ہو جو بی اے
اور ایم اے کا مرتبہ انگریزی خوانوں کے نزدیک ہے۔

علماء کے کارناموں کو تاریک کر کے دکھانا انھیں حقارت آمیز الفاظ سے یاد کرنا
تو آسان ہے لیکن عملاً اس کا ثبوت دینا کہ واقعی طور پر اسلامیہ کالجوں نے قوم مسلم کی
بحیثیت مذہبی اور قومی علوم کیا خدمت انجام دی ہنوز انگریزی درس گاہوں کے ذمہ
واجب الادا ہے جس کی ادائیگی مسلم یونیورسٹی سے متوقع ہے تجارتی اصول پر تعلیم

تو تمام یونیورسٹیاں دے رہی ہیں اس کے لئے تو ایک سو پچیس کالج موجود ہیں اور یونیورسٹیاں کچھ ہو گئیں اور کچھ اور ہوں گی مسلم یونیورسٹی کی تعلیم کو تو قومی درد کی دوا ہونا چاہیے نہ کہ ہندوستانی مصائب کی یونیورسٹی ہو جانے کے بعد اس تعلیم گاہ کو اپنا خصوصی اور امتیازی کارنامہ پیش کرنا ہوگا ؎

گرفتم کز حریفاں بیش یا کم می تواں گفتن

ز دستت تا چہ آمد آخر ایں ہم می تواں گفتن [1]

میرا یہ بھی خیال تھا کہ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیہ کا علاوہ درس و تدریس ایک یہ کام بھی ہونا چاہیئے کہ بہت سی ایسی کتابیں جن کی جلالت شان محقق و مسلم ہے جنھیں ہر اعلیٰ نصاب تعلیم نے اپنے کتب درسیہ کے ذیل میں داخل تو کر دیا لیکن قلمی اور کم یاب ہونے کے سبب سے طلبا کیا خود مدرسین و اساتذہ بھی اسم کے سوا مسمّیٰ تک رسائی نہ پا سکے ایسی کتابوں کو بعد تصحیح طبع کرایا جائے تاکہ مسلم یونیورسٹی کا بڑھتا ہوا فیض تشنگاں علوم کو جہاں کہیں بھی ہوں سیراب کرتا رہے۔

اسی نقطۂ نظر سے علمی کم یاب اور نایاب کتابوں کی اشاعت کو منجملہ خدمات اسلامک اسٹڈیز ایک خدمت قرار دیتے ہوئے بعض کتابوں کے متعلق کام شروع کر دیا گیا ہے اگر یونیورسٹی اُن کے چھپنے کا اہتمام اپنے ذمہ لے لے گی تو پھر کسی اور کتاب کی تصحیح وغیرہ کی جا سکتی ہے۔

اسلامک اسٹڈیز کی تیسری فرع اسی ذیل میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کی ایک یہ خدمت بھی میں قرار دیتا ہوں کہ مفید عام اور اہم مضامین پر محققانہ بحث لکھ کر چھوٹی چھوٹی کتابوں کی شکل میں طبع کرا کر اہل ملک کے سامنے پیش کیا جائے ان امور کے اجرا سے طلبہ میں تحقیقات کا ذوق علم کی اُمنگ نظر کی دقت تصنیف کا طریقہ تفحص و تجسس [2] کا ملکہ پیدا ہوگا۔

[1] میں نے مان لیا کہ دوسرے لوگوں کے بارے میں کمی بیشی (ان کی خوبیوں اور خامیوں) کے بارے میں بات کی جا سکتی ہے۔ لیکن خود تمہارے ہاتھ سے کیا انجام پایا آخر اس پر بھی تو بات کی جا سکتی ہے۔ [2] تفحص۔ تلاش، جستجو، کھود کرید، ٹوہ (۲) کھوج لگانا، ڈھونڈنا

کیا عجب جو مسلم یونیورسٹی کے ان مجموعہ خدمات کا نتیجہ منزل رساں ثابت ہو درس و تدریس تصنیف و تالیف طباعت و اشاعت ان سب کا اثر ایسا ہو کہ قوم میں جامع افراد کا وجود مسلمانوں کی قومی زندگی کا خضر راہ[1] بن جائے اور یہ اصلی سعادت مسلم یونیورسٹی کے حصہ میں آئے وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

تاخیر کی علت اور چند التماس

فقیر کی ان تمام سمع خراشیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت تک جو تعلیم اسلامک اسٹڈیز کی شروع نہیں کی گئی اس کی علت کام سے اعراض و غفلت یا فن سے ناآشنائی و جہالت نہ تھی بلکہ موانع اور عوائق[2] کا زائل کرنا اور اس اہتمام بالشان شعبہ کی مستحکم تاسیس ملحوظ خاطر تھی ورنہ یوں تو محض نصاب تعلیم کے لئے کتابوں کا مقرر کر دینا کچھ زیادہ وقت کا خواہاں نہ تھا اور نہ ہے۔

چنانچہ اب کہ مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ میں بالفعل اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ کا ایک ایسا نصاب تعلیم مقرر کر دوں جسے طلباء بی اے کلاس فارسی یا عربی کے عوض میں لے سکیں، ایک نصاب تعلیم پیش کرتا ہوں لیکن اسماء کتب سے پیشتر چند ضروری التماس پیش کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اس ترتیب نصاب پر سہ

دست و پایم بشکستند و کمانم دادند[3]

صادق آئے گا مگر المامور معذور[4]۔

التماس اول اور اسلامک اسٹڈیز کا مفہوم

اولاً یہ گذارش ہے کہ ایک لفظ انگریزی کے دانانے ایک صاف اور بین مفہوم کو معما اور چیستاں بنا رکھا ہے علوم اسلامیہ یا مطالعات اسلامیہ کا لفظ اگر کہا جاتا تو لفظوں کے پھیر میں اصل مقصد گم نہ ہوتا اور مصداق و انطباق کے لئے سعی لاحاصل سے دماغ گرامان نصیب ہوتا۔

نہایت ادب سے گذارش ہے کہ لفظ اسلامک اسٹڈیز کو بمنزلہ کلی سمجھ لیجئے جس کے تحت میں بہت سے جزئیات ہیں یا اسے مرتبہ جنس میں رکھ کر یہ کہئے کہ اس کے تحت میں بہت سی انواع پائے

---

[1] خضر راہ۔ راہبر [2] عوائق (عائق کی جمع) موانع، باز رکھنے والی چیزیں [3] انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے اور مجھے کمان دے دی۔ [4] مامور، ماتحت عہدہ دار (۲) امر کیا گیا، حکم دیا گیا یا کیا گیا، وہ شخص جسے حکم دیا گیا ہو۔

جاتے ہیں جنس من حیث جنس یا کلی طبعی کا وجود خارج میں پایا جانا اہل منطق کے نزدیک بہت ہی معرکۃ الآرا اور سخت مابہ النزاع مسئلہ ہے جنس اپنے انواع میں پایا جائے گا اور کلی کا وجود افراد میں متحقق[1] ہوگا ایسی صورت میں اس کی تلاش کہ وہ کونسا خاص و مشخص[2] فن ہے جس پر لفظ اسلامک اسٹڈیز کی دلالت جنسی یا بحیثیت کلی طبعی ہوتی ہے ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی انسان کی تلاش اس کے افراد سے علٰحدہ ہو کر کرنا چاہے یا انواع سے بے نیاز ہو کر جنس کی جستجو شروع کرے مثلاً زید عمرو بکر خالد ولید وغیرہ سے جب چشم پوشی کر لی جائے تو پھر انسان کا خارج میں مشاہدہ محال و ناممکن ہوگا یا اگر انسان بقر غنم وغیرہ حیوانات سے التفات[3] اس بناپر کہ یہ سب انواع ہیں یک سو کر لیا جائے تو حیوان کا دیکھنا میسر نہ آئیگا۔ لہٰذا نہایت ادب سے التماس ہے کہ انگریزی الفاظ کچھ سحر و طلسمات کے نقوش نہیں ہیں۔ جن کے سننے اور دیکھنے سے فہم و ذکا مسحور ہو جائے۔

التماس دوم اور نوعیت تعلیم | ثانیاً یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم گہری استوار اور مستحکم بنیاد پر قائم کرنا چاہئے معلم سے پڑھانے میں اور متعلم سے پڑھنے میں کامل اور صحیح محنت لی جائے اگرچہ اس صورت میں طلبہ کی تعداد زیادہ نہ ہوگی لیکن مے یک مرد جنگی بہ از صد ہزار[5] ملک و قوم کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے پر مغز ہو ٹھوس ہو آئندہ نسلوں کے لئے قابل تقلید ہو ملمع سازی سے بہت بڑا نقصان مشرقی علوم اور قوم مسلم کو پہونچ چکا۔ اب اس کی تلافی چاہئے نہ کہ اس کا اعادہ و تکرار۔

تکمیل کا درجہ بی اے کے بعد رکھا جائے اور صرف وہی شعبہ علوم اسلامیہ کا پڑھایا جائے جسے طالب العلم نے اختیار کیا ہو تاکہ پڑھنے والے کو اس فن میں ملکہ پیدا ہو سکے بی اے سے قبل محض زبان دانی یعنی عربی لٹریچر کی مستحکم تعلیم دی جائے اور بی اے میں ایسے علوم پڑھائے جائیں جن سے درجہ تکمیل کی تائید ہوتی ہو اور علوم اسلامیہ کی متوسط و اعلیٰ کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو۔

---

[1] متحقق۔ تحقیق کیا ہوا (۲) درست کیا ہوا، ٹھیک، ثابت شدہ [2] مشخص۔ تشخیص کیا گیا، جانچا ہوا، تخمینہ کیا گیا (۲) تجویز کیا گیا، خاص کیا [illegible]

[illegible]

بی اے پاس کو پچاس روپیہ ماہوار اور عربی ایم اے پاس کو سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے بغیر وظائف آغاز کار میں طلبہ کا مائل ہونا تقریباً ناممکن ہے حکومت سے استدعا کرکے اس سند کی قیمت عربی اور فارسی کے ایم اے سے گراں قرار دی جائے اس سے مقبولیت اس شعبہ کی زیادہ پائدار ہو جائے گی۔

التماس سوم اور اسلامک اسٹڈیز کے فروع کا تعیّن

سب سے ارفع و اعلیٰ اور اہم نوع اسلامک اسٹڈیز کی علوم دینیہ اور فنون شرعیہ ہیں مسلمانوں نے اغیار کے علوم کو جو سیکھا اور اُن میں اپنی مجتہدانہ قوت سے جو کچھ گراں بہا اضافے کئے وہ سب علوم شرعیہ کو مقبول اور ہمہ گیر بنانے کی غرض سے تھا اُن کا حقیقی مقصد علوم دینیہ کی خدمت گزاری تھی اور دیگر علوم بمنزلہ آلات تھے۔

کیا از روئے تحقیقات جدید علوم دینیہ پر فنون اسلامک اسٹڈیز کا لفظ کہا جائیگا اگر ایسا ہی تو پھر قرآن و حدیث اور فقہ مع لوازم و فروع کس مذہب و ملت کی اسٹڈی میں شمار کئے جائینگے اسے بھی واضح کر دیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی نے تھیالوجی یعنی دینیات کے نام سے اور ڈمنیس میں ایک شعبہ مستقل قائم کیا ہے اس سے شعبہ کی اہمیت کا اظہار مقصود ہے نہ کہ اسلامک اسٹڈیز سے اس کا اخراج۔

تفسیر اصول تفسیر فقہ اصول فقہ اصول حدیث اور فن اسماء الرجال ان سب علوم کی تدوین قرآن و حدیث کے افہام و تفہیم کی غرض سے ہوئی مسائل کا استنباط کیوں کر ہوتا ہے کسی خبر کو مرتبہ وثوق کا کیوں کر ملتا ہے راویوں کا پایۂ اعتبار کن اوصاف سے ثابت ہوتا ہے ایک اصل کلی سے جزئیات گوناگوں کیوں کر استخراج کئے جا سکتے ہیں ان سب علوم کی تدوین اور ترتیب و تہذیب سب سے پہلے اس خاکدان عالم میں مسلمانوں ہی نے کی ہے اور یہ سارے فنون مسلمانوں ہی سے مخصوص ہیں اور انھیں کے علوم شمار کئے جاتے ہیں تعجب و حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی اگر انھیں اسلامک اسٹڈیز میں شمار مسلم یونیورسٹی میں نہ کیا گیا۔

اسلامک اسٹڈیز کی دوسری فرع علم ادب بھی ایک شاخ علوم اسلامیہ کی ہو صرف و نحو معانی و بیان لغت اور علم الاشتقاق اس کے شعبے ہیں علم نحو کی ایجاد حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمائی ہے اور ابو الاسود نے ☆ اس کے اہم مسائل کی تدوین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے زمانے سے کی ہے اس کے بعد کلام مجید کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے علم معانی و بیان کا ایجاد ہوا خطباء اور شعراء جاہلیت کے قصائد و خطبات کو مسلمانوں نے جمع کیا تاکہ محاورات عرب پر بصیرت حاصل ہو لغات عرب کی تحقیق انیق کر کے فن لغت میں بیشمار کتابیں مدون کی گئیں اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ عربی کا سمجھنا صحت کے ساتھ عربی عبارت کا پڑھنا فصیح و غیر فصیح جملے و اشعار میں تمیز کرنا عربی الفاظ کے صحیح معانی اور مواقع استعمال سے آگاہ ہونا جن علوم سے سیکھا اور سکھایا جا سکتا ہو اور پھر اس کی تدوین بھی مسلمانوں ہی نے کی ہو انھیں کی ایجاد و تصنیف ہو اسے کس دلیل و تعلیل[1] سے اسلامک اسٹڈیز سے خارج سمجھا جائیگا۔

علاوہ ازیں قرآن عربی زبان اور محاورۂ عرب کے مطابق ہے حدیث کی بھی زبان خالص اور فصیح عربی ہے پھر جو زبان کہ کلام الٰہی اور احادیث مصطفوی کی ہو اس زبان کی واقفیت پر لفظ لغی کا اضافہ کر کے فن اسلامک اسٹڈیز کا اطلاق کیوں کر صحیح ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی کی تعلیم عربی پر ایک سرسری تنقید صفحات ماسبق میں کسی جگہ یہ عرض کر چکا ہوں کہ عربی علم ادب کا شعبہ اگرچہ ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں مدتوں سے قائم ہے لیکن ہر جگہ اس کی نصاب میں ابتری[2] اور تعلیم میں خامی و خستگی[3] ہے ضرورت اس کی ہو کہ نصاب تعلیم صحیح اصول پر مقرر کیا جاوے اور اس کی تعلیم صحت کے ساتھ جاری کی جائے تاکہ طالب العلم میں فہم معانی اور تمیز عبارت فصیح و بلیغ کی قوت و استعداد پیدا ہو سطحی تعلیم سے وقت برباد ہوتا ہے اور ایک کیفیت جہل مرکب[4] کی پیدا ہوتی ہو۔

☆ یہ حضرت ابو الاسود دؤلی براہ راست باب مدینۃ العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے کسب فیض کرنے کا شرف رکھتے تھے۔ مولا کے کاتب کی نگرانی اور راہنمائی نے ان پر وہ فیضان کیا کہ آنے والوں کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں حضرت عزیز الرحمٰن عزیز وارثی کی تالیف فصاحت و بلاغت (۱۹۵۲ء) ناشر کی نظر ہے۔ (محمد ابدالرحمٰن)

---

1. تعلیل ۔ وجہ بتانا، سبب نکالنا (۲) دلیل لانا، علت بیان کرنا (۳) قواعد میں تبدیل حروف علت یا اعراب کا باعث واضح کرنا
2. ابتری ۔ بربادی، خرابی، بدحالی (۲) بے قاعدگی
3. خستگی ۔ ماندگی، بیماری، تھکاوٹ (۲) زخمی پن (۳) رنج، دل گیری

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے تعلق میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس کی ابتری سے بوجوہ چند در چند بحث نہ کی جائے گی لیکن ایک سرسری تنقید اس لئے ضرور ہے تاکہ ابتری کا دعویٰ عوام تک کے فہم سے قرین و قریب ہو جائے ورنہ اہل علم کے لئے صرف نصاب کی کتابوں کا لکھ دینا ہی کافی ہے۔

بی اے میں ایک کتاب نثر کی ہے اور ایک نظم کی۔ نثر میں تاریخ ابو الفداء کے دو سو صفحات ہیں اور نظم میں دیوان حماسہ میں سے باب الحماسہ اور باب الادب۔

ایم اے کے آٹھ پرچے ہیں منجملہ آٹھ کے ایک انجیل سریانی زبان کا پرچہ ہی انجیل اسی لئے رکھی گئی ہے تاکہ طلبہ زبان سریانی[1] سیکھ سکیں اور پھر لغت و گرام سریانی کا عربی کے لغت و گرام سے مقابلہ اور توازن کریں یہ سریانی کتاب سو صفحے کے قریب چھوٹی تقطیع پر طبع ہوئی ہے گرام سریانی کی زبانی بطور املا پڑھائی جائے اور الفاظ مفردہ[2] و دیگر مبادی[3] جن سے انجیل کی سریانی عبارت پڑھی یا سمجھی جا سکے وہ بھی زبانی۔

قابل غور یہ امر ہے کہ طلبہ نے نہ بی اے میں عربی گرامر پڑھی نہ ایم اے میں نہ علم بدیع[4] سے آشنا ہوئے نہ معانی و بیان سے نہ اشتقاق[5] صغیر کی انھیں خبر ہوئی نہ اشتقاق کبیر سے آگاہی پھر ایسی صورت میں وہ مقابلہ کیا کر سکیں گے اور انھیں اس میں کیا کامیابی حاصل ہوگی۔

ثانیاً سریانی کے سو صفحات مذکورۂ بالا طرز پر پڑھ کر کیا سریانی[1] کی گرام اور اس کے لغات پر انھیں ایسی واقفیت ہو جائے گی جو ان کی تحقیقات منزل رساں کہی جا سکے۔

دوسرا پرچہ مقدمہ ابن خلدون کا ہی کامل مقدمہ پڑھایا جائے گا اہل علم سے مقدمہ ابن خلدون کی اہمیت مخفی نہیں فلسفہ تاریخ کے بیان میں صرف یہی ایک کتاب ہی امتحان میں سوال و جواب ادبی انداز میں ہوگا یا بہ حیثیت فلسفۂ تاریخ یہ ایک معمہ ہے جس کے جواب سے میں قاصر ہوں۔

---

[1] سریانی۔ ایک قدیم زبان [2] مفردہ۔ مفرد، اکیلا، اکیلا اکیلا ہوا، علاحدہ (۲) واحد، ایک (۳) غیر مرکب (۴) یگانہ، یکتا، منفرد [3] مبادی۔ (مبدا کی جمع) کسی فن کی ابتدائی باتیں (۲) ظاہر کرنے والا، ظاہر ہونے کی جگہیں (۳) ابتدائی امور، شروع میں سکھانے کی باتیں، بنیادی باتیں، ابتدائی اصول [4] بدیع۔ نیا، نادر، انوکھا، نرالا (۲) موجد، بنانے والا (۳) نئی بات، نیا بنانے والا۔ ایسی چیز بنانے والا جس کا [illegible] [5] اشتقاق۔ [illegible] (۵) [illegible] (۶) [illegible]

آخری پرچہ تاریخ کا ہوگا یا فلسفہ کا طالب علم کو اختیار ہو کہ ان دو مضمونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرے تاریخ میں ایک حصّہ طبری کا ہی اور ایک حصّہ فتوح البلدان بلاذری کا۔

فلسفہ میں تہافتہ الفلاسفہ غزالی اور ابن رشد اور شیخ کی کتاب النجاۃ کامل (یعنی مختصر الشفا)
قابل لحاظ یہ امر ہے کہ تہافتہ علم کلام میں ہے اور بہت ہی مغلق[1] ہے جب تک کوئی کتاب علم کلام اور فلسفہ کی نہ پڑھ لی جائے تہافتہ کا پڑھنا پڑھانا وقت برباد کرنے کے مرادف ہے۔

النجاۃ ایک ضخیم کتاب ہے اور نہایت ہی سنگلاخ[2] ہے اس میں منطق بھی ہے اور حکمت کے جملہ شعبے اس میں مسطور ہیں شیخ کی کتاب شفا جب کہ متعدد ضخیم جلدوں میں بڑھ کر بہت بڑی کتاب ہوگئی تو انہوں نے انہیں مسائل کو اختصار کے ساتھ جمع کر کے اس کا نام النجاۃ رکھا۔
میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کتاب بغیر ابتدائی کتابوں کے پڑھے ہوئے کیوں کر پڑھی اور پڑھائی جا سکتی ہے۔

ایک پرچہ ترجمہ کا ہے اور ایک مضمون نگاری کا صرف تین پرچے نظم و نثر عربی کے ہیں جن میں معلقات نابغہ متنبی تا ردیف قاف حریری کے چند مقامات اور لامیۃ العرب ہے
قابل استفسار یہ امر ہے کہ طالب العلم نے کس فن کی تعلیم پائی اور کس علم کے تکملہ کی سند اسے یونیورسٹی نے عطا کی عربی علم ادب پر اسے بصیرت ہوئی یا سریانی زبان کا وہ عالم ہوا تاریخ پڑھ کر وہ مورخ ہوا یا فلسفہ و علم کلام کا درس لے کر وہ فلسفی و متکلم ہوا۔
مضامین مختلفہ کا تداخل بے ترتیب کتابوں کا داخلہ بغیر علم معانی و بیان فن ادب کی تکمیل کے عطار یہ سب چیستان یا علمی بھول بھلیاں ہیں۔

اس اجمالی تنقید سے جہاں نصاب کی بے عنوانی کا اظہار ہوتا ہو اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کی ایک شاخ پہلے سے یہاں موجود ہی لیکن اس میں نہ برگ و بار ہے نہ تازگی و شادابی اگر شعبہ ادبیہ کے نصاب تعلیم کی ترتیب و تہذیب کر لی جائے

---

[1] مغلق۔ مقفل، بند دروازہ (۲) پیچیدہ کلام، دقیق بات، ادق، سخت اور دور از فہم الفاظ، مشکل کلام جس کے معنی سمجھنا دشوار ہو۔

تو نہایت سہولت و آسانی سے ایک شعبہ اسلامک اسٹڈیز کا قائم ہوا جاتا ہے۔
نہ معلوم کس منحوس ساعت میں تقلید یورپ کا قلادہ تعلیم کے گلے میں ڈالا گیا تھا کہ باوجود زخموں سے چور چور ہو جانے کے بھی اس زخمی پر رحم نہیں کیا جاتا ہے بلکہ بوجھ میں کچھ اور افزونی پیدا کی جارہی ہے۔

میں نے علم منقول یعنی علوم دینیہ اور شرعیہ و نیز علم ادب یعنی عربی لٹریچر مع اس کے لوازم کو اسلامک اسٹڈیز کی شاخ کہا ہے اور صحیح کہا ہے لیکن اگر اس کی سند درکار ہے تو کشف الظنون علامہ سیوطی اور مقدمہ ابن خلدون کا باب سادس ملاحظہ ہو علاوہ ان کے مدینۃ العلوم ابجد العلوم مفتاح السعادت وغیرہ کی طرف نظر ڈالی جائے سلف سے خلف تک ان علوم و فنون کو علوم اسلامیہ میں شمار کرتے آئے ہیں جرجی زیدان ملک شام کا مشہور عیسائی مصنف جس کے خوشہ چیں اس وقت کے سارے مستشرقین ہیں اس کی کتاب علوم العرب دیکھ لی جائے وہ بھی یہی کہہ رہا ہے جو کچھ علماء اسلام نے کہا اب دلیل و نظائر کے ہوتے ہوئے بھی اگر یہی کہا جائے کہ اسلامک اسٹڈیز کی حقیقت کچھ اور ہے تو پھر اس دعوے کی بوالعجبی کی کوئی حد نہ ہوگی۔

عہد اسلام کی ریاضی اور اس کی تعلیم

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ ریاضی کے شعبے فی الحقیقت اسلامک اسٹڈیز کے مصداق ہیں لہٰذا یونیورسٹی میں اس کی تعلیم کا اجراء اسلامک اسٹڈیز کا درس سمجھا جائے گا۔

اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ ریاضی کی کیا خصوصیت ہے دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہ تھا جسے مسلمانوں نے سیکھا نہ ہو اور کچھ اضافہ نہ کیا ہو تفصیل کا یہ موقع نہیں اگر زمانے کی پریشانیوں سے امان نصیب ہوا تو ملک و قوم کے سامنے کسی وقت پیش کردوں گا اس وقت صرف اس قدر کہنا ہے کہ ریاضی کی تعلیم یورپ کی زبانوں میں بہت سہولت اور شرح و بسط کے ساتھ منقول ہو چکی ہے عربی میں اسے پڑھانا کوئی فائدہ خاص نہ دے گا۔

ثانیاً یہ کہ اس فن کی بہت سی کتابیں نایاب ہیں محنت وسعی سے جو کچھ قلمی نسخے فراہم ہوں گے اُن کی تصحیح وطبع کے لئے ہزاروں کی رقم درکار ہوگی اس وقت عربی میں فن ریاضی کی کتابیں اس سلسلہ کے ساتھ موجود نہیں ہیں جس تسلسل کے ساتھ از ابتدا تا انتہا انگریزی میں ریاضی کی کتابیں پائی جاتی ہیں جرمنی و فرانس کا مرتبہ تو انگریزی سے بھی زیادہ ہے۔

فن ریاضی کے متعلق مسلم یونیورسٹی میں یہ کام بہت اچھا انجام پاسکتا ہے کہ کسی لائق ریاضی داں پروفیسر کو جس کے دماغ میں جودت وجدت بھی ہو اور کچھ زمانہ تعلیم میں صرف کرکے اپنی معلومات کو جلا دے چکا ہو یورپ بھیجا جائے وہ جرمنی و فرانس کی یونیورسٹیوں میں جاکر یہ تحقیق کرے کہ ریاضی کے شعبے کیوں کر ترقی کر رہے ہیں اور کس حد تک پہنچ چکے ہیں اس کی تعلیم کے لئے کن سامانوں کی ضرورت ہے پھر ہندوستان آکر اُن قلمی کتابوں کو جو علم الاعداد اور ارثماطیقی میں مسلمانوں کی مدونہ[1] ہیں یا فن ہیئت میں جو مسلمانوں کی خالص تصانیف ہیں ان کا مطالعہ کرے۔

دو عالم ایسے جنھیں عربی کی ریاضی میں دستگاہ[2] کامل ہو اور جنھوں نے اس فن کو پڑھا ہو اور پڑھایا ہو اس کے ساتھ کئے جائیں پھر یہ دونوں مشرقی و مغربی اساتذہ مل کر متفقہ مطالعہ سے یہ تحقیقات کریں کہ مسلمانوں نے اس فن کو کہاں تک پہنچایا تھا کتنے مسائل ایسے ہیں کہ آج تک اُن پر مزید اضافہ تحقیق کا نہ ہو سکا اور کتنے مسائل ایسے ہیں کہ مسلمانوں کی تحقیق پر حال کی تحقیق سے اضافہ ہوا وہ کونسے مسائل ہیں کہ اگر مسلمانوں کو زمانہ مہلت دیتا تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے جس پر آج یورپ کے ریاضی داں پہنچے کچھ مسائل ایسے بھی ہوں گے کہ اصول میں یورپ اور مشرق کے تغائر ہوگا لیکن نتیجہ دونوں سے ایک ہی حاصل ہوگا۔

الغرض اس دور ایام میں تحقیقات و اکتشافات[3] فن ریاضی کے متعلق البتہ کی جاسکتی ہیں

---

۱ مدونہ۔ جمع کی گئیں، جمع کی ہوئیں (۲) مرتبہ ۲ دست گاہ۔ مقدور، طاقت، قدرت، قابو، دسترس (۲) علم و فضل (۳) دانش مندی
۳ اکتشافات (اکتشاف کی جمع) ... (۲) ...

لیکن اب اُسے عربی میں پڑھانا اور اس کا درس جاری کرنا مصارف بیکراں[1] کا برداشت کرنا اور قلیل فائدہ کا حاصل کرنا ہے کتابیں کالعدم اساتذہ کم یاب فنون میں پراگندگی[2] ایسی صورت میں جب تک علم و فن کو جمع نہ کر لیا جائے تعلیم کیوں کر ہوگی اور اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

تحقیقات بے شک مفید ہوگی بشرطیکہ تعصب اور یورپ کے عشق سے یک سو ہو کر اہل فن کے طرز اور محققین کی شان پر کی جائے۔

میں اس کام کے لئے پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی کو نہایت موزوں اور مناسب خیال کرتا ہوں علاوہ ازیں کہ یہ ریاضی کے کامیاب پروفیسر ہیں قوت فکریہ ان کی صحیح ہے دماغ ان کا صاف ہے مذہب کا درد ہے قومی اور اسلامی عصبیت ان میں زندہ ہے مزید برآں عربی زبان سے بھی کافی واقفیت رکھتے ہیں چند روز کی محنت میں علماء ریاضی داں کے لئے اچھے مشیر ہو جائیں گے اب میں اپنے اس اجمالی بیان کی کسی قدر تفصیل کرتا ہوں۔

علم ہندسہ | فن ریاضی کی تین شاخیں ہیں ایک کا نام علم ہندسہ دوسرے کا علم الاعداد اور تیسرے کا ہیئت ہے پھر ان میں سے ہر ایک کی متعدد شاخیں ہیں مسلمانوں نے ہر فرع کو لیا اور انھیں ابتدائی و ضمنی حالت سے اٹھا کر ایک وجود استقلالی عطا کر دیا مثلاً علم ہندسہ کے مختلف مسائل کو جب کہ اپنی تفصیل و تشریح اور برہان و دلیل سے ایک مستقل علم کے مرتبہ تک پہنچایا ہے تو یہ ایک فن پندرہ علوم کی صورت میں جلوہ گر ہوا جس میں سے علم المناظر علم المرایا والانعکاس علم جرالاثقال علم المساحت علم الاوزان والموازین علم البنکامات خصوصیت کے ساتھ بنی آدم کے لئے منفعت رساں ثابت ہوئے۔

علم العدد | اسی طرح علم العدد کی دس شاخیں ہوئیں جن میں سے ایک جبر و مقابلہ ہے اس شعبہ کو علم و فن کا مرتبہ مسلمانوں نے عطا کیا خود الفاظ جبر و مقابلہ یہ بتا رہے ہیں کہ یہ علم مسلمانوں

۱ بیکراں - بے پایاں، بے نہایت ، [illegible]

کی قوت فکریہ اور مجتہدانہ دماغ کا نتیجہ ہے اس فن میں مختصر، متوسط اور مبسوط ہر طرح کی کتابیں مسلمانوں نے تصنیف کی ہیں مثلاً مختصرات میں المفید ابن محلی موصلی کی متوسط میں طوسی کی کتاب الظفر اور مبسوط میں ابن محلی کی جامع الاصول اور ابوشجاع ابن اسلم کی الکامل مسلمانوں کی جودت وحدت پر شاہد عدل ہیں۔

ہیئت علم ہیئت میں مسلمانوں نے جو جدوجہد کی ہے اور جس تھوڑی سی مدت میں اسے ایک وسیع علم کا مرتبہ دے دیا گیا اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے صرف ایک فن ہیئت سے پچیس علوم کی نہریں مسلمانوں نے جاری کر دیں متقدمین اور متاخرین نے بیشمار کتابیں علوم ہیئت کے متعلق تصنیف کی ہیں مجسطی جو بطلیموس کی تصنیف ہے یہی کتاب علم ہیئت کی بنیاد ہے حکیم نصیر الدین طوسی نے پسندیدہ زیادتوں کا اس پر اضافہ کر کے تحریر مجسطی بنائی پھر علماء ہیئت نے تحریر مجسطی کی شرحیں لکھیں جن میں نظام الدین نیشاپوری کی شرح سب سے قدیم تر ہے اس کے بعد عبدالعلی برجندی نے بہت مفصل شرح لکھ کر اس کے دعووں کو مستحکم اور مضبوط کیا علامہ قطب الدین شیرازی نے اس فن کو اپنی نئی تحقیقات سے بہت کچھ بڑھایا ان کی تحفۂ شاہیہ ایک پسندیدہ یادگار ہے لیکن ہنوز نظام بطلیموس کی بنیاد پر بہت سے مشکلات تھے جس کو علماء ہیئت حل کرتے رہے آخر میں علامہ خضری نے اکثروں کو بہت اچھی طرح حل کر دیا۔ نہایت الادراک اور شرح تذکرہ ان کی جلالت شان پر دو معتبر دلیلیں ہیں مولوی غلام حسین کی جامع بہادر خانی جو فارسی زبان میں ہے اس فن میں نہایت ہی نادر تالیف ہے اور قابل درس مطالعہ ہے علاوہ مسائل ہیئت کے علم ہندسہ اور علم الاعداد کے مباحث و مسائل بھی اس میں ہیں یہ کتاب ایک مرتبہ چھپی تھی اکثر علماء کے کتب خانوں میں یہ موجود ہے۔

جامع بہادر خانی سے بھی زیادہ جامع اور بسیط قانون مسعودی ابوریحان بیرونی کی ہے لیکن یہ کتاب قلمی ہے اور نسخے اس کے کم یاب ہیں کتب خانہ ریاست رام پور میں نہایت الادراک شرح تذکرہ اور تحفہ شاہیہ موجود ہے اخوان الصفا کا پورا نسخہ وہاں موجود ہے اس کے بعض رسائل میں ہیئت وغیرہ کی بہت اچھی تحقیق ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۴۴) ۱؎ جہل مرکب۔ ایک مرض نفسانی، جس میں انسان باوجود عدم علم اس امر کے علم سے بھی ناواقف ہوتا ہے کہ وہ ناواقف ہے لیکن اپنے آپ کو عالم و فاضل سمجھتا ہے۔

ان امور کا ذکر اس مقصد سے پیش کیا گیا کہ فن ریاضی میں سے حساب کا شعبہ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو اس کی ایجاد کی ضرورت پہلی فرد انسان کو پیش آئی ہو گی جمع تفریق ضرب و تقسیم کے متعلق یہ کہنا کہ اسے فلاں قوم نے ایجاد کیا ایک غیر صحیح نسبت کا منسوب کرنا ہی یہ ایسے مسائل نہیں جو تمدن اور عمران سے پیدا ہوتے ہوں بلکہ ان کی تاریخ پہلے فرد انسان کے دوش بدوش ہی علیٰ ہٰذا علم ہیئت کے ابتدائی مسائل بھی ایشیا کے صحرا نشینوں کے مطالعہ میں سب سے پہلے آئے ایسے مقامات جہاں کی زمین کی سطح مستوی اور مطلع و آفاق صاف تھا وہاں کے صحرا نشینوں نے سب سے پہلے اجرام فلکی کا مطالعہ کیا الغرض ریاضی کی ابجد علم ہندسہ ہو یا علم ہیئت کسی خاص قوم کی ایجاد نہیں کہی جا سکتی ہاں ان میں علمی شان اور استخراج نتائج کے لئے وضع اصول و قواعد کی تاسیس اس وقت ہوتی تب کہ دنیا آباد ہو کر مختلف علوم و فنون کی تدوین میں مشغول ہوتی اس حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے صفحات یہ بتاتے ہیں کہ ہندوستان اور مصر نے سب سے پہلے ریاضی کو حیثیت علمی تک پہنچایا لیکن ہنوز اس کی حالت ایک طفل نوزائیدہ سے زیادہ نہ تھی ہاں جب مسلمانوں نے اس ہونہار بچہ کو اپنی آغوش شفقت میں لیا ہی تو اس کے اعضا میں بالیدگی اور نشو و نما پایا گیا تا آنکہ مرتبہ شباب تک پہنچا۔

لیکن مرتبہ عقل تک آنے کے لئے اور اعضا کے مستحکم و توانا ہونے کے لئے ابھی اسے کچھ اور تربیت کی حاجت تھی۔ پس اس فن کے تین دور فرض کر لئے جائیں۔ ادنیٰ مرتبہ تو ہندوستان و مصر میں اس کا گزرا وسطا کا حصہ مسلمانوں کی تربیت کا رہین منت ہی اس کے بعد یورپ نے درجہ تکمیل کی ابتدا کی ہے۔

افراط و تفریط سے گزر کر اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو اس عہد رواں میں فن ریاضی کو ترقی یافتہ شکل میں تسلیم کرنا پڑیگا یہ دعویٰ کہ آج جس شکل میں ریاضی موجود ہے اس کی یہی شکل و صورت علماء اسلام کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوگا جیسا کہ پندرہ سولہ برس والے کے لئے اس وقت جب کہ اس کی عمر چوبیس پچیس برس کی ہو جائے یہ کہا جائے کہ اس کے اعضا نامیہ

میں کچھ تغیر نہ ہوا لیکن اسی کے ساتھ یہ دعویٰ کہ مسلمانوں میں ریاضی کے فنون سے کوئی آشنا نہ تھا یا یہ کہ یہ فن مسلمانوں کے پاس محض خامی کی حالت میں تھا لاعلمی و ناآشنائی کی دلیل ہے پہلے دعوے میں اگر تعصب بیجا ہے تو دوسرے دعوے میں یورپ کے دماغی و ذہنی غلامی اور والہانہ تقلید کا ثبوت ہے مسلمانان سلف کا بڑا کمال یہی تھا کہ ان کا ذہن صافی حکمائے یونان و مصر کی تقلید و غلامی سے محض بے نیاز تھا ان کا مطالعہ مجتہدانہ اور محققانہ تھا جس میں تقلید کا شائبہ تک نہ تھا جیسا کہ ذیل کی چند مثالوں سے ثابت ہوگا

ہیئت کا پہلا مدرسہ مصر میں مدرسہ اسکندریہ کی بنیاد فن ہیئت کے لئے پہلا مدرسہ ہے تاریخ اس سے پہلے کسی مدرسہ کا وجود نہیں بتاتی ہے اس مدرسہ کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے دو شخص ایسے گزرے ہیں کہ ان کی بدولت اس مدرسہ کا نام ہمیشہ عظمت و عزت سے لیا جائے گا پہلا شخص تو ہیفورک ہے جس نے طول البلد اور عرض البلد کا اصول ایجاد کیا دوسرا شخص بطلیموس ہے جس کی کتاب مجسطی اس کے کمال کو سامنے لاتی ہے علم ہیئت کے مسائل پراگندہ طور پر اہل فن کی زبانوں پر تھے اور کچھ غیر مسلسل طرز پر مکتوب تھے بطلیموس نے انھیں ترتیب و تہذیب کے ساتھ جب جمع کیا تو اس کتاب کا نام مجسطی رکھا یونانی قدیم میں مجسطی کے معنی ترتیب و تدوین ہیں۔

ہیئت کی طرف مسلمانوں کا میلان خلفاء عباسیہ کے دوسرے فرماں روا ابو جعفر منصور کو اس کا شوق پیدا ہوا اسی زمانہ میں مسلمانوں کی توجہ فن ہیئت کی طرف مائل ہوئی مامون الرشید کے زمانے میں اس فن پر بہار چھا گئی مجسطی کا ترجمہ ہوا رصدگاہیں تیار ہوئیں اور وہ کل آلات جن کا ذکر مجسطی میں آتا ہے تیار کئے گئے نیز دیگر ضروری آلات کو مسلمانوں نے خود ایجاد کیا۔

مسلمانوں کی پہلی تحقیق مدار ستارے حکمائے قدیم کے نزدیک کوئی ایجاد وجود مستقل نہیں رکھتے تھے بلکہ کرۂ نار جیسے کرۂ ہوا کے اوپر وہ تسلیم کرتے ہیں یہ اسی کرہ پر

(بقیہ صفحہ ۵۳) روشنی ہوتی [illegible] (فرہنگ عامرہ)

کے اثرات و نتائج خیال کئے جاتے تھے علامہ قوشچی نے انھیں ستارہ بتایا اُن کا وجود مستقل قرار دیا ان کی جگہ قطبین[1] کے پاس بتائی حال کی تحقیق نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اُن کے طلوع کی مدت متعین کی اور زمین سے اُن کا بُعد مسافت دریافت کیا۔

دوسری تحقیق بطلیموس نے ایک ہزار بارہ ثوابت[2] کا شمار کیا تھا لیکن عبدالرحمٰن صوفی نے تین ثوابت اور اضافہ کرکے یہ بتایا کہ تعداد ثوابت[2] کا شمار نامکمل ہے حال کے ہیئت جاننے والوں نے ہزاروں تک شمار پہنچا دیا۔

تیسری تحقیق قدمائے یونان ثوابت میں کسی طرح کی حرکت کے قائل نہ تھے بطلیموس نے اُن کی حرکت کا اقبال کیا افلاک کے تین سو ساٹھ درجے قائم کئے اور ایک درجہ سو شمسی سالوں میں ثوابت کا طے کرنا تحقیق کیا ابن الاعلم نے ستر برس بتایا مگر محی الدین مغربی نے ستر کی جگہ چھیاسٹھ سال شمسی میں ثوابت[2] کا ایک درجہ فلکی طے کرنا تحقیق کیا۔

چوتھی تحقیق قدما عطارد اور زہرہ کو آفتاب کے اوپر مانتے تھے لیکن بطلیموس نے تخمینی طور پر اُن کے وجود کو آفتاب کے نیچے کہا تھا مسلمانوں میں ابو عمران اور محمد بن عبدالکریم نے زہرہ کو ایک تل کی طرح آفتاب کے نیچے دو مرتبہ معائنہ کیا ابن سینا نے بھی زہرہ کا اسی طرح معائنہ کیا ابن ماجہ اندلسی نے زہرہ اور عطارد دونوں کا معائنہ اس طرح کیا کہ گویا آفتاب کے رخسار پر یہ دونوں دو تل ہیں اسی مشاہدہ سے عطارد و زہرہ کا آفتاب کے نیچے ہونا ثابت کیا گیا۔

پانچویں تحقیق حکمائے قدیم بلا استثناء اس کے قائل تھے کہ چاند کے سوا دیگر سیارے بذات خود روشن ہیں لیکن یہ خاص تحقیقات مسلمانوں کی ہے کہ دیگر سیارے بھی مثل ماہتاب آفتاب سے کسب ضیاء کرتے ہیں جس طرح چاند ہلال بعض بدر محاق وغیرہ کے منازل عشرہ طے کرتا ہے بعینہ اسی طرح دیگر سیارے بھی انھیں منازل کے رہبر ہیں۔

چھٹی تحقیق آفتاب و ماہتاب بے داغ وجہہ تسلیم کئے جاتے تھے ابن رشد نے

---

[1] قطبین۔ قطب جنوبی اور قطب شمالی [illegible] کی رات اور چھ مہینے کے دن کا ہے

دونوں کو داغ دار بتایا جس کی تفصیل علامہ عبدالعلی برجندی نے کی زمانہ حال کی ہیئت نے توپہاڑ تک کا وجود آفتاب میں معائنہ کیا ہے۔

ساتویں تحقیق حکمار قدیم کا یہ مسلک تھا کہ چاند کی حرکت میں کیفیت استوا[1] ہی لیکن چوتھی صدی ہجری میں ابوالوفا نے اس کے خلاف آواز بلند کی اس نے بتایا کہ چاند کی حرکت اپنے دورہ میں ایک طرح کی نہیں رہتی ہی کبھی تیز ہوتی ہی اور کبھی سست ان حرکات کا نام اس نے اضطرابات قمریہ رکھا اب ضرورت اس کی ہوئی کہ کوئی ایسا صحیح اصول قائم کیا جائے جس سے چاند کا ٹھیک طور پر مقام معلوم کیا جا سکے اور اس میں اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی تھی جب تک تیز اور سست چال کو ملا کر ایک صحیح اوسط معتدل نہ نکالا جائے۔ مسلمانوں نے معادلۃ السرعۃ کے نام سے ایک ایجاد تازہ کا اضافہ کیا اس ایجاد نے ابوالوفا کے نام کو حیات جاوید بنا دیا۔

فائدہ ۔فیثاغورث اور بطلیموس کا یہ مابہ الاختلاف مسئلہ کہ زمین گھومتی ہی یا آسمان خاص تحقیقات کا طالب ہی۔ بربنائے تحقیق فیثاغورث زمین کی دو حرکتیں ہیں ۔ایک حرکت وضعی جس کا نتیجہ لیل ونہار اور ستاروں کا طلوع وغروب ہی۔ دوسری آنی جسے ایک برس میں زمین طے کرتی ہے اور اس کا نتیجہ موسموں کا اختلاف ہی بطلیموس کے نزدیک زمین ساکن ہی آسمان موجود بوجود ذاتی ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں اور ہر آسمان کی حرکت جداگانہ ہے لیل ونہار اور موسموں کا اختلاف انھیں آسمانوں کے اختلاف حرکات کا نتیجہ ہے مسلمانوں کی تحقیق بطلیموس کے موافق ہی۔ علاوہ مشاہدہ بعض دلائل الٰہیہ وطبعیہ بطلیموس کی تائید میں ہیں یہ مسئلہ خصوصیت کے ساتھ تشنۂ تحقیق ہے۔

مذکورۂ بالا امثلہ سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ مسلمانوں نے نہ صرف مدرسہ اسکندریہ کے کارناموں کو باقی اور محفوظ رکھا بلکہ اس میں اپنی تحقیقات سے چار چاند لگا دئے اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ تحقیق کا قدم ہر روز آگے بڑھ رہا ہی اس وقت قدیم ریاضی کی خدمت

[1] استوا۔ ہمواری، برابری، برابر ہونا، یکساں ہونا (۲) جواں ہونا (۳) قصد کرنا (۴) قابو میں لانا (۵) ظاہر ہونا، قرار پکڑنا (۶) جبر فیہ [illegible] تصرف کرے۔

اسی طرز کی مفید ہو گی جس کا تذکرہ صفحہ ماسبق میں گزرا لیکن اس کے لئے کتابوں کی فراہمی سب سے مقدم ہے۔

یہی حال علم العدد کا ہے مسلمانوں نے اس میں خاص اجتہادات کئے ہیں لیکن اس وقت ہر مسئلہ کے حل کرنے کے لئے گوناگوں قواعد وضع ہو چکے اور تعلیم میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے بے شمار کتابیں یورپ سے چھپ کر تعلیم گاہوں میں پہنچ رہی ہیں لیکن اسلامی علم العدد اپنی جگہ پر ہے۔

اصول اعداد علاوہ جبر و مقابلہ کے علم العدد کے دو اور اہم شعبے ہیں ایک کو اصول اعداد کہتے ہیں اس فن میں اعداد کے کلی حالات دلائل برہانی سے عام ہندسی دلیلوں کی طرح ثابت کئے جاتے ہیں مثلاً جب ایک عدد کسی دوسرے عدد کے جزو معین میں ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب برابر ہو گا اس عدد کے ساتھ جو مضروب فیہ کو مضروب کے اسی جزو میں ضرب دینے سے حاصل ہو جیسے پندرہ کو بارہ کے ثلث یعنی چار میں ضرب دیا تو ساٹھ حاصل ہوا تو یہی عدد اس وقت بھی حاصل ہو گا جب بارہ کو پندرہ کے ثلث یعنی پانچ میں ضرب دیں چنانچہ بارہ پنجے ساٹھ اب بھی ہے۔

اقلیدس نے ساتویں مقالہ سے لے کر دسویں مقالہ تک اصول اعداد کو ہی بیان کیا ہے۔ شیخ نے شفا میں اس سے بھی بحث کی ہے لیکن بالفعل یہ فن انگریزی میں اقلیدس سے علحدہ کر لیا گیا ہے اور اس کے طریقۂ تعلیم میں آسانی پیدا کی گئی ہے ایسا نہیں ہے کہ انگریزی میں اصول اعداد متعارف و معلوم نہیں۔

ارثماطیقی ارثماطیقی میں عدد کے خواص استقرائی دلیلوں سے ثابت کئے جاتے ہیں اس کا بھی ایک مسئلہ سمجھانے کی غرض سے لکھا جاتا ہے تاکہ مثال سے یہ معلوم ہو جائے کہ انگریزی میں اس کا کیا نام ہے مثلاً ہر عدد کا مربع یعنی پہلی قوت برابر ہے اس کے

دونوں حاشیوں کے حاصل ضرب اور اصل عدد اور حاشیے کے فرق کے ساتھ یعنی درمیانی عدد کے مربع کے ساتھ جیسے پانچ کا مربع پچیس ہے تین اور سات یہ دونوں عدد حاشیے ہیں درمیانی عدد دو ہے جس کا مربع چار ہے اور یہی دو کا عدد پانچ اور تین سات اور پانچ میں تفاوت ہے تین جس قدر پانچ سے کم ہے اسی قدر سات پانچ سے زیادہ ہے اب اگر حاشیئے کو یعنی تین اور سات کو ضرب دیں پھر درمیانی عدد کے مربع کو یعنی چار کو اس میں جمع کر دیں تو نتیجہ پچیس آئے گا اور یہی نتیجہ پانچ کے مربع کا ہے اس کا ذکر شیخ نے شفا کی ریاضیات میں کیا ہے ابن ہیثم نے مصادرات اقلیدس کی شرح میں لکھا ہے کہ اصول اعداد کلی دلیلوں سے ثابت کئے جاتے ہیں اور ارثماطیقی استقرائی دلائل سے ثابت ہوتے ہیں لیکن یہاں استقرا[1] سے بھی قابل وثوق علم حاصل ہوتا ہے۔

میں نے انگریزی میں ان فنون کے متعلق کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن ماہرین کی زبانی اس کا علم ہوا ہے کہ یہ علم بھی انگریزی میں منتقل کر لیا گیا ہے اور اس کو جاننے والے بھی موجود ہیں۔

میں نے تفصیل کے ساتھ فن ریاضی کے اہم شعبوں کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ صدیوں سے یہ فن مسلمانوں کی تربیت سے محروم ہو گیا ہے اس لئے پہلے اس کی تحقیقات کرنا چاہئے کہ اس فن کی تعلیم عربی میں سہل ہے یا انگریزی میں کتابوں کا ملنا، اساتذہ کا بہم پہنچنا کس کے لئے آسان ہوگا مسائل کی تنقیح دلائل کی قوت کہاں زیادہ ہے اس تحقیق کے بعد جو ثابت ہو اس پر مسلم یونیورسٹی کو عمل درآمد ہونا چاہئے سردست بجز شرح چغمینی تو سطات میں اور کوئی عمدہ کتاب چھپی ہوئی نہیں ملتی ہے اب میں حسب الحکم نصاب کی کتابیں لکھتا ہوں جنھیں صیغۂ دینیات اور اسلامک اسٹڈیز نے منظور کر لیا ہے۔

---

[1] استقرا۔ تتبع پیروی کرنا، پیچھے جانا (۲) بہت ڈھونڈنا، تلاش کرنا، جستجو کرنا (۳) جمع کرنا (۴) خاص چیز سے عام نتیجہ نکالنا (۵) اصطلاح منطق میں وہ دلیل، جس سے کسی چیز کے چند افراد پر تجربہ کر کے اس کے تمام افراد پر وہی قاعدہ مقرر کر دیں۔

نصاب تعلیم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(فقہ)۔ (۱) مختصر القدوری کامل (۲) ہدایہ جلد اول کامل (۳) ہدایہ جلد دوم میں سے مذکورہ ذیل ابواب :۔ کتاب النکاح (۲) محرمات (۳) باب الاولیاء والاکفاء (۴) باب الوکالت (۵) باب المہر (۶) کتاب الطلاق (۷) باب طلاق السنہ (۸) باب ایقاع الطلاق (۹) باب الرجعۃ (۱۰) باب فیما تحل بالمطلقہ (۱۱) باب الخلع (۱۲) باب الایلاء (۱۳) باب الظہار (۱۴) باب اللعان (۱۵) باب العدت (۱۶) باب النفقۃ (۱۷) کتاب الرضاعۃ (۱۸) کتاب الوقف کامل (۴) ہدایہ جلد سوم میں سے :۔ (۱) کتاب الہبہ (۲) کتاب العاریہ (۳) کتاب الودیعہ (۵) ہدایہ جلد چہارم کامل باستثنائے ابواب ذیل :۔
کتاب التحری ۔ کتاب احیاء الموات ۔ کتاب الخنثیٰ ۔ کتاب الحیل ۔ کتاب الجنایات ۔ کتاب الدیات ۔ کتاب المعاقل ۔ کتاب الفرائض ۔

(اصول فقہ)۔ اصول شاشی (حدیث) مشکوٰۃ شریف کامل (اصول حدیث) رسالہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی جو ابتدائے مشکوٰۃ میں مطبوع ہے (اسماء الرجال) جو آخر مشکوٰۃ میں مطبوع ہے (تفسیر) مدارک سورۃ بقرہ کامل (اصول تفسیر) الفوز الکبیر شاہ ولی اللہ دہلوی (کلام) تمہید ابو شکور سالمی (فرائض) سراجی ۔

نصاب تعلیم اسلامک اسٹڈیز

شعبہ معقول فن حکمت

منطق ۔ مرقاۃ مولٰنا فضل امام رحمۃ اللہ علیہ ۔

طبعیات ۔ ہدیہ سعیدیہ ۔ علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ ۔

الٰہیات ۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ ۔ مولانا سید حسین ۔ میبذی و مولانا عبدالحق خیرآبادی

شعبہ اسلامک ہسٹری

تاریخ عہد بنو امیہ و بنو عباس از کتاب الفخری۔

مقدمہ ابن خلدون کا باب چہارم پنجم ہشتم۔

توجیہ و تعلیل تعین نصاب

مرقاۃ۔ فن منطق میں ایک بہت ہی جامع متن ہے مصنف اس کا ادیب ہے اس لئے اس کی عبارت صاف اور شستہ ہے۔ متعلم اگر فن منطق سے آشنا ہے تو صرف اس ایک کتاب سے فن منطق کا ایک ربع علم بطور اجمال متعلمین کے ذہن نشین کر سکتا ہے۔

ہدیہ سعیدیہ۔ فن طبیعیات میں بے مثل متن متین ہے اس کا مصنف فن ادب میں امام الائمہ اور استاذ الاساتذہ ہے اس کی عبارت کی روانی بیان کا تسلسل اور دلائل کی شگفتگی نے علمی مسائل کو ایک لہکتا لہکتا چمن بنا دیا ہے دماغ اس کے مطالعہ سے خستہ و مضمحل نہیں ہوتا بلکہ ذوق مطالعہ میں افزونی ہوتی ہے۔

میبذی۔ یہ کتاب ہدایۃ الحکمت کی شرح ہے اور طالب العلمانہ شان میں لکھی گئی ہے قیل و قال کا سلسلہ اس میں کہیں ختم نہیں ہوتا اسے نصاب میں رکھنے کی یہ وجہ ہے کہ طالب العلم میں دقت نظر پیدا ہو اعتراض و شبہ سن کر طبیعت مضطر نہ ہونے پائے لیکن فن کا مسئلہ محققانہ طور پر سیکھنا ضرور ہے اس لئے ہدایۃ الحکمۃ کی شرح جو مولانا عبد الحق خیر آبادی نے کی ہے اس کے ساتھ منضم کر دی گئی۔ شرح حکمۃ العین اور شرح حکمۃ الاشراق اگر اس نصاب کے بعد پڑھی جائیگی تو اس میں سہولت اور وقت کے صرف میں اچھی کمی ہو جائے گی لیکن ہر بحث کے خاتمہ پر استاد و معلم کو ایک محققانہ مسلسل تقریر بطور یاد داشت طلبہ کو تحریر کرا دینا چاہیئے۔

اس نصاب کے بعد طالب علم کو اختیار ہوگا کہ ایم اے میں خواہ فلسفہ اور منطق لے کر تکمیل کرے یا فن کلام کی تحصیل میں کمال پیدا کرے۔ علم کلام کے لئے اس قدر منطق و فلسفہ

کا پڑھنا ضروری ہے اس لئے بی اے میں فن معقول کا ایک ایسا نصاب ترتیب دیا گیا جو درجہ تکمیل میں منطق و فلسفہ یا فن کلام دونوں میں معاون و ممد ہو سکے نیز شعبہ منقول یعنی دینیات پڑھنے والوں کے لئے بھی اس قدر فن معقول کی واقفیت بہت ضروری ہے جس سے مصطلحات منطق و فلسفہ کا انہیں علم ہو جائے اور اس فن سے مجملاً آگاہ ہو جائیں اس لئے کہ اصول فقہ کی جملہ کتابیں اور فقہ میں ہدایہ، شرح وقایہ اور الاشباہ والنظائر ان پر بصیرت تامہ جب ہی ہو سکتی ہے جب کہ اس قدر فن معقول سے طالب العلم آشنا ہو۔

توجیہ و تعلیل اسلامی تاریخ یہ شعبہ انگریزی میں قائم ہو چکا ہے اس لئے بالفعل اسی کی مطابقت و موافقت سے عربی میں اسلامی تاریخ کا دور بنو امیہ اور بنو عباس مقرر کیا اگرچہ آئندہ چل کر آغاز اسلام سے ۳۰ سنہ ہجری تک کا واقعہ نصاب میں داخل کرنا ہوگا۔

اسلام کی تاریخ فی الحقیقت اسی چالیس برس پر صادق آتی ہے اس کے بعد اقوام مسلم کی تاریخ ہے دور بنو امیہ فتوحات کی حیثیت سے ممتاز ہے اور بنو عباس کا عہد علمی کارناموں سے تابناک و درخشاں ہے لیکن سلطنت کے ساتھ نبوت کی شان ہر حرکت و سکون میں جہاں نمایاں اور تاباں ہے وہ صرف آغاز نبوت سے ۳۰ سنہ ہجری تک ہے۔

علاوہ ازیں یورپ کے بعض متعصب مصنفین نے جو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کئے ہیں ان کا صحیح جواب اور ان کے اعتراض متعصبانہ کی اصل حقیقت محققانہ طور پر جب ہی معلوم ہو سکتی ہے جب کہ سیرت اور تاریخ کی مستند کتابیں عربی میں پڑھی جائیں۔

عربی میں اس شعبہ کی تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ طلبہ میں ذوق تحقیق پیدا ہو۔ انگریزی مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے اُسے اصل مآخذ میں جب پڑھیںگے تو واقعات کے صحت و سقم کی تنقیح عالمانہ اور مجتہدانہ طرز پر کر سکیں گے یہ شعبہ بہت وسیع ہے سلاطین، علماء اور علم ان سب کی تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ بالفعل ۲۶ سنہ کے لئے تاریخ میں الفخری اور فلسفہ تاریخ میں مقدمہ ابن خلدون کا باب چہارم پنجم اور ششم مقرر کیا گیا ہے۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ علوم عربیہ مرتبہ علم کا رکھتے ہیں انھیں علمی شان سے پڑھنا اور پڑھانا تحقیق کا ذوق پیدا کرنا فی الحقیقت اسلامک اسٹڈیز کا اجرا ہے سطحی تعلیم سے نہ تحقیقی نام آوری ہے نہ قومی خدمت نہ علمی سرپرستی۔

علوم دینیہ کا نصاب اپنی توجیہ و تعلیل سے بے نیاز ہے بی اے پاس کرنے کے بعد اس نصاب کو دو برس میں طالب العلم ختم کریگا بعد کامیابی بیچلر آف تھیالوجی کی ڈگری اُسے دی جائے گی ماسٹر آف تھیالوجی کا نصاب اس کے بعد متعین کیا جائیگا۔ زیادہ زیادہ

حررہ بقلمہ

آپ کا فرماں بردار

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

چیرمین اسلامک اسٹڈیز

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
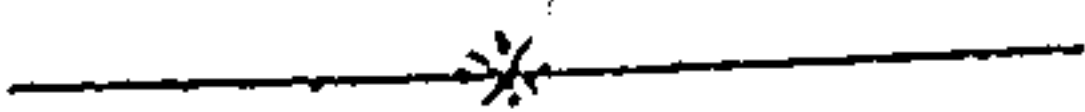
ہدیہ عقیدت

سید عارف محمود مہجور رضوی

مقتدائے علم و دانش، پیکرِ فقر و غنا — صاحب فہم و فراست، مجمعِ فضل و کمال

عالمِ اسلام کا وہ نابغہ، فردِ فرید — آج بھی تازہ ہے جس کی فکر کا حُسن و جمال

اُس کی ہستی تھی مثالِ دیدہ ور پیدا ہوئی — ذات اُس کی بے بدل، ثانی محال

وہ تدبر کا ہمالہ، وہ بصیرت کا وجود — دینِ حق کا وہ مفکر، ملّتِ بیضا کی ڈھال

رہنمائی قوم و ملّت کو عطا کی برمحل — اللہ اللہ دیدنی تھی مردِ حق کی چال ڈھال

اعلیٰ حضرتؒ کے سیاسی فلسفہ کا وہ امیں — حق سے پایا جس نے اوجِ فکر سے مملو خیال

بارگاہِ رضویت کے فیضِ بے پایاں کے ساتھ — کشتیِ اُمت کے طوفاں سے لیا اُس نے نکال

رہبروں کو اُس نے بخشا رہنمائی کا شعور — وطنیت کے زخم کا بر وقت کر کے اندمال

گاندھوی افکار کی تغلیط اور تکذیب میں — مصلحت خاطر میں لایا نہ وہ مردِ خوش خصال

البلاغ و المبیں، النور کی تصنیف سے — کر دیا اسلامیوں کا دین سے رشتہ بحال

عظمتِ فکر و عمل سے کر کے خود کو سُرخرو — قوم کے نباض نے کی پیش اک عمدہ مثال

اُس کے فیضاں سے علی گڑھ مرجعِ ایماں بنا — عُمر بھر اُس کا رہا جس سرزمیں سے اتصال

اہلِ سُنّت کا تشخص اُس نے واضح کر دیا — کانگریس کے مولوی کی کر کے رد ہر ایک چال

اُس کی تحریروں کی عظمت آج بھی تابندہ ہے — اُس کا اندازِ نگارش آج بھی ہے بے مثال

مشعلِ رہ آج بھی ہیں اُس کے قدموں کے نشاں — نور کا مینار اُس کی زندگی کے ماہ و سال

مولانا سید سلیمان اشرف کی تصانیف

- ☆ نزھۃ المقال فی لحیۃ الرجال ۱۸۹۸ء
- ☆ تحقیق وحاشیہ (امتناع النظیر) ۱۹۰۸ء
- ☆ البلاغ ۱۹۱۴ء
- ☆ الخطاب ۱۹۱۵ء
- ☆ الانہار مقدمہ ہشت بہشت (مثنوی امیر خسرو) ۱۹۱۷ء
- ☆ الرشاد ۱۹۲۰ء
- ☆ النور ۱۹۲۱ء
- ☆ روداد مناظرہ ۱۹۲۱ء
  (تحریک خلافت اور مسئلۂ ترک موالات پر ابوالکلام آزاد کے ساتھ مکالمہ)
- ☆ السبیل ۱۹۲۴ء
- ☆ مسائل اسلامیہ (مضامین) مرتبہ مولوی عبدالباسط علیگ ۱۹۲۴ء
- ☆ الحج ۱۹۲۸ء
- ☆ المبین ۱۹۲۹ء

کاروانِ علی گڑھ کے حُدی خواں مولانا سید سلیمان اشرف صاحب

سرفروشانِ تحریک علی گڑھ کے سلسلہ زریں کی داستان بڑی طویل اور تہہ دار ہے۔ اسلاف کے کارناموں کی قدرشناسی کا جذبہ قدرے بیدار ہو اور دیدۂ بینا سے کام لیا جائے تو ہمیں چمن سرسید کے علمی افق پر ان فدایانِ چمن کے بکھرے ہوئے لعل و گہر کے ڈھیر صاف نظر آجائیں۔ ہاں ان میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں جن کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت اور مردانہ حق گوئی و بے باکی کے جذبے نے دین و ملت کے تئیں اپنی خدمات اور اپنے مقام و مرتبے کو حتی الامکان پردۂ خفا میں ہی رکھنا چاہا۔ یقیناً ایسی ہستیوں کے کارناموں سے روشناسی یک گونہ مزید توجہ کی متقاضی ہوگی۔

(ڈاکٹر سید عبدالباری)

[illegible]